معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

۱۷۵ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۵ء تا ماہ جون ۲۰۰۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

مضامینِ معارف

۱۷۵ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۵ء تا ماہ جون ۲۰۰۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

تلخیص

جلد ۱۷۵ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۵ء عدد ۱

فہرست مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

ای میل : email : shibli academy @ rediffmail. com

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

۲۶؍دسمبر ۲۰۰۴ء کی صبح جنوب مشرقی ایشیا میں صبح قیامت بن گئی، سمندری زلزلے اور طوفانی لہروں کے تھپیڑے طوفان نوح کا نمونہ پیش کرنے لگے اور نگاہ تصور کے سامنے فرعون کے مع اہ لشکر سمندر میں پھینکے جانے کا منظر آگیا، ایران کے شہر بام کا زلزلہ بھی اس قیامت خیز طوفان کے سامنے ہیچ نظر آنے لگا، اس تباہی و بربادی نے پورے خطے کو ہلا اور ساری دنیا کو دہلا دیا، سب سے زیادہ انڈونیشیا اس کی لپیٹ میں آیا ہے، تھائی لینڈ، ملیشیا، مالدیپ، سری لنکا اور ہندوستان میں جزائر انڈومان و نکوبار اور اڑیسہ، تامل ناڈو، پانڈیچری اور آندھرا پردیش بھی طوفان کی قہر سامانی کی زد میں آئے، اب تک کی اطلاع کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمی نَسیاً منسیاً ہوچکے ہیں، زخمیوں اور خانماں بربادوں کی تعداد اس سے کئی گنا سوا ہے، آبادیاں نیست و نابود ہوگئی ہیں، گھروں میں سوئے ہوئے لوگ سوتے ہی رہ گئے، صبح صبح سمندر کی سیر کا لطف لینے والے تہہ آب چلے گئے، کھیل کود میں مصروف بچے لقمہ اجل بن گئے، تعطیل گزارنے کے لیے گھر چھوڑ کر جانے والوں کو اپنے گھروں میں واپس آنا اور خاندان والوں سے ملنا نصیب نہیں ہوا، غرض جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا اور ان کی بے گور و کفن لاشیں زبان حال سے کہہ رہی ہیں:

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

سانپ نکل جانے کے بعد اب لکیر پیٹنے کا عمل شروع ہوگیا ہے اور ماہرین فن اور سائنس داں قیاس آرائیاں کر رہے ہیں اور اسباب و علل کی تحقیق و تفتیش میں سرگرداں ہیں مگر ابھی تک کسی قطعی اور یقینی نتیجے تک نہیں پہنچے ہیں، ایک بہت عام بات جو اس طرح کے موقعوں پر اکثر کہی جاتی ہے، اس دفعہ بھی کہی جارہی ہے کہ پہلے سے یہ پتہ کرلیا گیا ہوتا تو اس قدرتی آفت سے بچا جاسکتا تھا، دوسرے اگر یہ ممالک قدرتی آفتوں کی پیشگی خبر دینے والی اور فضائے بسیط میں نصب کی جانے والی سٹیلائٹ تنظیم کے رکن ہوتے تو اتنے بڑے پیمانے پر تباہی نہ آتی، یہ خبر بھی آئی ہے کہ سنامی لہروں کے طوفان کے بارے میں امریکہ میں موجود مشاہداتی مراکز کو اطلاع ہوگئی تھی اور اس نے امریکی سفارت خانوں، فوج اور حکومت آسٹریلیا کو خبر بھی دے دی تھی مگر چوں کہ ایشیائی ملکوں کے ساتھ ایسا کوئی رابطہ نہیں

تھا کہ انھیں اطلاع دی جاتی، دوسرے یہ کہ وہ اس معاہدے کے رکن بھی نہیں ہیں، اس طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری ہی رہے گا کہ دوسرے حادثے کی اطلاع آجائے گی، ہندوستان کے وزیر اعظم نے بجا طور سے اسے قومی آفت قرار دے کر یہ کہا ہے کہ ہندوستانی قوم خود اس سے نمٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس طرح کے حوادث میں ایک مسلمان کی نظر صرف برق و بخارات تک محدود نہیں رہتی جو فیضان سماوی سے محروم قوموں کا انداز فکر و نظر ہے ؎

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

بلاشبہ قرآن مجید نے بھی کہا ہے کہ یہ ساری کائنات انسان کے لیے مسخر کردی گئی ہے اور اس کے تصرف میں بادل اور ہوائیں بھی ہیں اور شمس و قمر اور بحر و بر بھی ؎

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں

کون سائنس اور ٹکنالوجی کی برتری کا انکار کرے گا، اس کے کرشمے اور کمالات ہر دیدہ بینا کو نظر آتے ہیں، اسی کی بدولت انسان نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، ستاروں پر کمندیں ڈالیں، سیاروں کو مسخر کیا، چاند میں بستیوں کا پتا لگایا، مریخ پر پودے اگانے کی تیاری کی مگر زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنا اور اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنا اسے نصیب نہ ہوا اور نہ یہ راز اس پر منکشف ہوا کہ آدمی خدا کی مرضی اور مشیت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا وَمَا تَشَآؤُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ، اس طرح کے واقعات بخت و اتفاق سے نہیں ہوتے، اللہ کے حکم سے ظہور میں آتے ہیں، قرآن نے اسی لیے بخت اور بے فکر ہوجانے پر متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تصرف اور قوت تسخیر کے باوجود تم اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہو وہ جب چاہے اچانک دبوچ لے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا، وہ کہتا ہے کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر راتوں رات آفت آجائے اور وہ سو رہے ہوں اور دن چڑھے ان پر ہمارا عذاب آدھمکے جب وہ کھیلتے ہوں اور سارے علم و آگہی اور واقفیت و تجربے کے باوجود مجبوری و بے بسی، عجز و ناتوانی اور ضعف و شکستگی کی تصویر بنے رہیں اور اپنا بچاؤ نہ کرسکیں۔

اس الم ناک حادثے اور اس میں ہونے والی ہلاکت و بربادی نے گزشتہ قوموں اور ملتوں کو پیش آنے والے ان واقعات کی تصدیق کردی ہے جن کو قرآن مجید نے عبرت، تذکیر اور خدا کی قوت قاہرہ اور قانون مجازات کے اثبات کے لیے جابجا بیان کیا ہے، جن کو پہلے کے مرفہ الحال لوگوں کی

طرح آج کل کے ارباب خرد بھی قصہ و افسانہ کہہ کر جھٹلاتے اور مذاق اڑاتے ہیں، قرآن کہتا ہے
کہ قوت و اقتدار کے نشے میں اکڑنے اور اترانے والی کتنی بستیوں کی معیشت کا ساز و سامان ملیا
میٹ کردیا گیا اور ان کے اجڑے گھر دوبارہ آباد نہیں ہوسکے، دوسری جگہ کہا ہر ایک کو ہم نے اس
کے جرم کی پاداش میں دھرلیا، کسی پر کنکر پتھر برسانے والی برفانی ہوائیں (حاصب) بھیجی، کسی کو
گرج اور کڑک (رعد و برق) نے دھرلیا، کوئی زمین میں دھنس گیا اور کوئی غرق آب ہوا، بعض
اقوام کے نام لے کر جن کا نام ہی عربوں کی زبان میں امم بائدہ پڑ گیا مثلاً عاد، ثمود، اہل مدین اور
قوم لوط وغیرہ، یہ سب تیز و تند خشک ہوا یا موسم سرما کی بادصرصر کڑک دمک، اولے، زلزلے اور
سنگ گل کی بارش سے جب معدوم ہوئیں تو یا اکھڑے درختوں کی جڑوں اور تنوں کی طرح ڈھیر
ہوگئیں یا اپنے گھروں میں اوندھے منھ پڑی کے پڑی رہ گئیں اور نہ اٹھ سکیں اور نہ اپنا بچاؤ کرسکیں
اور ان کے گھر اس طرح کھنڈر ہوئے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کبھی وہ آباد بھی تھے۔

یہ ساری قومیں اپنے زمانے میں نہایت متمدن اور شان و شوکت والی تھیں، ان کا بڑا
رعب و دبدبہ بھی تھا مگر عذاب الٰہی کے سامنے ان کی دانائی، دانش مندی اور دور اندیشی ان کے کام
نہیں آئی، آج کے ترقی یافتہ زمانے میں سائنس نے غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کی ہے مگر فَوْقَ كُلِّ
ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ، انسان کو جو اقتدار و تمکن اور تصرف و تسخیر دی گئی ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہیں کیا
گیا اور اللہ کی بخشی نعمتوں اور صلاحیتوں کی قدر نہیں کی گئی تو اللہ کی گھات کے سامنے ساری ذہانت،
تدبیر اور وسائل دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، یہ دنیا نہ بے مقصد ہے اور نہ اندھیر نگری ہے،
اس کا خالق و مالک اسے نظام عدل و قسط کے ساتھ چلا رہا ہے، خدا کی مقرر کردہ میزان سے کوئی چیز
سر مو تجاوز نہیں کرسکتی، انسان کو بھی اس کا پابند بنایا گیا ہے اگر وہ اس سے تجاوز کرے گا اور اللہ کی دی
ہوئی مہلت سے فائدہ نہ اٹھا کر بدعنوانی کرے گا، اس کے نظام حق و عدل میں خلل انداز ہوگا اور
زمین میں شر و فساد برپا کرے گا تو اللہ کے قانون مکافات سے وہ نہیں بچ سکے گا، اہل ایمان کے لیے
ان واقعات میں بڑا سبق پنہاں ہوتا ہے، یہ ان کی غفلت کے لیے ایک تنبیہ اور ایمان و یقین میں
پختگی کا باعث بنتے ہیں، امتیاز رنگ و نسل اور تفریق ملل کے بہ جائے اسلام کا مقصود وحدت آدم ہے،
اس لیے سارے مسلمانوں کو اپنے مظلوم اور بے سہارا بھائیوں کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے۔

☆☆☆

مقالات

''صدیق اکبرؓ''—ایک مطالعہ

از:- ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

یرموک کس کے عہد میں فتح ہوا؟ خلافت صدیقی کے عہد میں شام میں جو فتوحات ہوئیں
ان سے متعلق شدید اختلافات ہیں، اس میں بھی اختلاف ہے کہ یرموک کا واقعہ عہد صدیقی میں پیش
آیا یا خلافت فاروقی میں؟ طبری اور ابن اثیر یرموک کے اس واقعہ کو اجنادین سے پہلے مانتے ہیں
لیکن ازدی، واقدی اور بلاذری کے ہاں سب سے بڑا معرکہ جو شام میں خلافت صدیقی میں ہوا
ہے وہ اجنادین ہے، یرموک کا واقعہ ۱۵ھ میں پیش آیا۔

مولانا کی تحقیق میں واقعہ کی شکل یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی عراق سے روانگی سے قبل قیصر روم
نے اپنی فوجیں واقوصہ میں جو یرموک سے متصل تھا جمع کردی تھیں، اسلامی اور رومی فوجیں آمنے
سامنے تقریباً دو ماہ تک پڑی رہیں لیکن معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے حضرت خالدؓ عراق کا محاذ مثنیٰ کے سپرد کرکے شام کے لیے روانہ
ہوئے اور محسوس کیا کہ جنگی نقطۂ نظر سے واقوصہ یا یرموک کو میدان جنگ بنانا مناسب نہیں ہے،
اس لیے انہوں نے واقوصہ کے بہ جائے دمشق کا رخ کیا، اسلامی فوجیں وہاں سے ہٹیں تو رومیوں
نے اجنادین میں مورچہ جمادیا، حضرت خالدؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ دمشق کا ارادہ ترک کرکے
اجنادین پہنچ گئے اور سخت معرکے کے بعد کامیابی حاصل کی۔

مولانا نے واقعہ کی یہ شکل پیش کرکے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق پیدا کی ہے کہ
حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یرموک میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صرف دونوں طرف کی فوجوں کا اجتماع
ہوا، اس عہد میں شام میں سب سے بڑی جنگ اجنادین کی ہے، جن لوگوں نے واقوصہ میں افواج

کے اجتماع کو ہی جنگ یرموک سمجھ لیا ہے، انہوں نے یرموک کو اجنادین پر مقدم کر دیا ہے لیکن جن کی نظر اصل جنگ پر ہے، انہوں نے یرموک کے واقعہ کو ۱۵ھ کا واقعہ لکھا ہے۔ (ص ۲۸۵، ۲۸۶)

حضرت ابوبکرؓ کا روزینہ خلیفہ ہونے کے بعد قوم نے حضرت ابوبکرؓ کا جو روزینہ مقرر کر دیا تھا اس کی مقدار میں اختلاف ہے، ابن سعد نے یہ تمام روایتیں نقل کر دی ہیں، مولانا کی رائے میں ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ

> ''پہلے حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب وہ کافی نہیں ہوتا تھا تو اس میں اضافہ ہونے لگا اور ادھر فتوحات کے باعث اسلامی ریاست کی مالی حالت بھی بہتر ہوتی جا رہی تھی، اس بنا پر شدہ شدہ آپ کا وظیفہ چھ ہزار درہم سالانہ ہو گیا''۔ (ص ۲۶۶، ۲۶۷)

حضرت ابوبکرؓ کی ذوالقصہ کو روانگی عبس و ذبیان وغیرہ غدار قبیلوں کو ان کی غداری کی سزا دے کر مسلمانوں کا انتقام لینے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے بہ نفسِ نفیس ایک فوج لے کر ذوالقصہ کی روانگی کا ارادہ کیا، صحابہ کرام نے بڑی منت و سماجت کی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ روانہ ہونے لگے تو حضرت علیؓ سواری کی باگ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے ''میں آپ سے وہی کہوں گا جو آنحضرتؐ نے غزوۂ احد کے موقع پر آپ سے کہا تھا یعنی یہ کہ آپ اپنی تلوار میان میں کیجیے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دردمند نہ کیجیے'' لیکن سب کے جواب میں انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا اور میں اپنے نفس کے ساتھ تمہاری غم خواری قبول نہیں کر سکتا، چنانچہ اپنا لشکر لے کر ذوالقصہ روانہ ہو گئے اور قبایل کو شکست دے کر ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور عبس و بنو ذبیان نے جن مسلمانوں کو شہید کیا تھا ان کا انتقام لے کر فتح و کامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے مدینہ واپس آ گئے۔

اس کے حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے کہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ کی درخواست قبول کر لی اور وہ خود واپس ہو گئے اور لشکر روانہ کر دیا، حالاں کہ طبری وغیرہ میں ہے کہ آپ نے یہ مشورہ منظور نہیں فرمایا اور بہ نفسِ نفیس تشریف لے گے۔ (ص ۱۷۷)

یہاں مولانا نے نہ دونوں روایتوں میں تطبیق دی اور نہ کسی کو ترجیح دی مگر فحوائے کلام سے

ظاہر ہے کہ وہ طبری وغیرہ کی رائے کو مرجح سمجھتے ہیں، ایک اور جگہ بنو تغلب پر حملے میں جو عورتیں گرفتار ہوئی تھیں ان ہی میں طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق ربیعہ بن بجیر تغلبی کی بیٹی بھی تھی لیکن بلاذری کے حوالے سے انہیں ربیعہ کے بہ جائے حبیب بن بجیر کی بیٹی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ربیعہ بن بجیر کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھی۔ (حاشیہ ص ۲۶۵)

قبایل اور شہروں کے ناموں اور بعض دوسرے امور کی تحقیق کے متعلق محققانہ و معلومات افزا حواشی سے بھی مصنف کی تلاش و جستجو اور تحقیق و محنت کا اندازہ ہوتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ابن الدغنہ جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو ہجرت حبشہ کے موقع پر اپنی پناہ میں لیا تھا قبیلہ قارہ کے سردار تھے، مولانا قارہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ بنو الہون بن خزیمہ کا قبیلہ ہے، تیر اندازی میں ضرب المثل تھا، کہتے ہیں انصف القارۃ من راماھا یعنی جس نے قبیلہ قارہ کے ساتھ تیر اندازی میں مقابلہ کیا اس نے اس کے ساتھ انصاف کیا، بحوالہ النھایہ لابن الاثیر''۔ (حاشیہ ص ۸)

ثنیۃ العقاب کے متعلق لکھتے ہیں ''عقاب حضرت خالد کے علم کا نام تھا، آپ نے اس جگہ پہنچ کر یہ علم نصب کیا تھا، اس لیے اس جگہ کا نام ثنیۃ العقاب ہو گیا''۔ (حاشیہ ص ۲۸۱)

حدیقۃ الموت کے متعلق عام محدثین و مورخین کا خیال یہ بتایا ہے کہ مسیلمہ سے جنگ یمامہ میں لڑی گئی اور حدیقۃ الموت جس میں مسیلمہ قتل ہوا تھا، اس کی نسبت یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی تھا لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے ثابت کیا ہے کہ مسیلمہ کا باغ یمامہ میں نہیں بلکہ مقام ہجر میں تھا۔ (ص ۲۲۱، ۲۲۲)

اسی طرح مالک بن نویرہ کا مختصر حال تحریر کیا۔ (ص ۲۰۰)

ابلہ کے متعلق یہ نوٹ تحریر کیا کہ ''یہ مقام دجلۂ بصرہ کے کنارے پر خلیج فارس کے کونہ میں جو شہر بصرہ تک آتا ہے واقع ہے اور بصرہ چوں کہ حضرت عمرؓ فاروق کے عہد میں آباد ہوا ہے اس لیے اس سے مقدم ہے''۔ (ص ۲۴۴)

مورخین کے رجحان کے مطابق عراق میں پہلی جنگ جو لڑی گئی وہ غزوۂ حفیر یا ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے، حفیر خلیج فارس کے قریب اور کاظمہ کی سرحد پر واقع ہے، مدینہ سے بصرہ تک

اگر ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو ھفیر اسی خط پر بصرہ سے پہلے واقع ہوگا، اس مقام کا حاکم ہرمز تھا جو حکومت ایران کے ماتحت تھا ... (ص ۲۴۵)

بعض غلط خیالات کی اصلاح و تصحیح

حضرت ابوبکرؓ کو عتیق کہے جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ تین بھائی تھے اور ان کے نام عتیق، معتق اور معیتق تھے لیکن اصل یہ ہے کہ عتیق نام نہیں بلکہ لقب تھا، ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے ان کو دیکھا تو فرمایا انت عتیق اللّٰہ من النار (ترمذی ج ۲، ص ۲۱۴) تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد ہو، اسی وقت سے ان کا لقب عتیق پڑ گیا، اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ سے بھی صاف تصریح ہے کہ عتیق آپ کا لقب ہی تھا۔ (ص ۲)

عام تاریخوں میں اور بعض روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی رائے کے مطابق آنحضرتؐ کا اسیران بدر کو زر فدیہ لے کر آزاد کر دینا اور انہیں قتل نہ کرنا بارگاہ ایزدی میں پسندیدہ نہیں ہوا اور اس پر یہ آیت بہ طور عتاب نازل ہوئی:

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ — اگر خدا کا لکھا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو کچھ
فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال) — تم نے لیا اس پر تم کو بڑا عذاب ہوتا۔

مولانا سعید احمد صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آیت عذاب الٰہی پر دلالت کرتی ہے لیکن عتاب کا سبب قیدیوں کو قتل نہ کرنا اور زر فدیہ لے کر ان کو رہا کر دینا نہیں بلکہ مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو جانا ہے، درآں حالیکہ اب تک مال غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ (ص ۳۷)

مرض الموت میں رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ اس حکم کے مطابق وہ تین دن تک نماز پڑھاتے رہے لیکن ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ کی حیات میں تین مرتبہ نماز پڑھائی، مولانا سعید احمد صاحب نے خود ابن سعد ہی کے حوالے سے اس میں یہ تصحیح و تطبیق دی ہے۔

لیکن اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن سعد خود ہی فرماتے ہیں کہ "ان تین نمازوں سے وہ نمازیں مراد ہیں جن میں آنحضرتؐ نے خود حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی ورنہ یوں تو انہوں نے سترہ مرتبہ نماز پڑھائی"۔ (حاشیہ ص ۵۹)

حضرت ابوبکرؓ سے بیعت میں حضرت علیؓ کی تاخیر کے متعلق جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن کو جمع نہیں کر لوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا، بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علیؓ کی طرف سے بیعت نہ کرنے کا عذر بتایا ہے لیکن مولانا سعید احمد فرماتے ہیں کہ اگر یہ کوئی عذر ہے بھی تو عذر بارد ہے، چند منٹ کے لیے بیعت کے واسطے آجانا جمع قرآن کے کام میں کیوں کر خلل انداز ہو سکتا تھا۔ (حاشیہ ص ۴۷)

بعض غلط روایتوں کی بڑی شد و مد سے مدلل تردید کر کے اسے جعلی اور اضافہ قرار دیا ہے، مثلاً ایک روایت ہے کہ خریم بن اوس طائی نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ سے عرض کیا تھا کہ اگر اللہ آپ کے ہاتھوں حیرہ فتح کرا دے تو آپ بنت بقیلہ (حیرہ کے ایک نامور خاندان کی لڑکی) مجھ کو عطا فرمائیے گا، جب حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے صلح کرنی چاہی تو خریم نے ان سے کہا کہ بنت بقیلہ کو آپ صلح میں داخل نہ کریں کیوں کہ رسول اللہؐ اس کو مجھے دے چکے ہیں، خریم کے اس دعویٰ کی تصدیق بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ نے بھی کر دی تو حضرت خالدؓ نے اس عورت کو صلح میں شامل نہیں کیا اور وہ خریم کے حوالے کر دی گئی لیکن چوں کہ یہ عورت اس وقت ۸۰ برس کی بڑھیا تھی اس لیے خریم نے اس عورت کے اہل خاندان سے ایک ہزار درہم لے کر اسے ان کو واپس کر دیا، جب لوگوں نے خریم سے کہا یہ آپ نے کیا کیا کہ بنت بقیلہ کو اتنے سستے داموں فروخت کر دیا تو خریم نے جواب دیا کہ "مجھ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد اور ہے"۔

مولانا نے فتوح البلدان بلاذری سے یہ روایت نقل کی ہے اور بتایا ہے کہ طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر جیسے مورخین تک نے بھی اسے نقل کیا ہے مگر ان کے نزدیک یہ ایک غلط افسانہ ہے اور روایت اصول روایت کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور درایۃً بھی، ان کے دلائل ملاحظہ ہوں:

۱- اس میں ہی اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کس شخص کا ہے، بلاذری نے قبیلہ بنو طے کے خریم بن اوس کا بتایا ہے لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص سے کیا تھا، ابن کثیر، ابن اثیر اور طبری نے اس شخص کا نام شویل لکھا ہے۔

۲-طبری نے اس عورت کا نام کرامہ اور حافظ ابن حجرؒ نے شیما لکھا ہے۔

۳-طبری میں ہے کہ رسول اللہؐ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ حیرہ بہ زور شمشیر (عنوۃ) فتح ہو لیکن جب وہ صلحاً فتح ہوا تو نہ خریم کو اس کے طلب کرنے کا حق تھا اور نہ حضرت خالدؓ اس مطالبہ کو منظور کر سکتے تھے۔

۴-حضرت خالدؓ نے بنت بقیلہ کو شرایط صلح سے مستثنیٰ اور مدعی کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا تو بنت بقیلہ کے رشتہ دار معترض ہوئے لیکن بنت بقیلہ نے کہا، آپ لوگ مجھے جانے دیں، اس شخص نے مجھ کو جوانی میں دیکھا تھا اور شاید یہ سمجھتا ہے کہ جوانی ہمیشہ رہتی ہے، اسی برس کی بڑھیا دیکھ کر خود ہی واپس کر دے گا، سوال یہ ہے کہ اگر بنت بقیلہ کو عہد شباب میں دیکھ کر یہ شخص دل دے بیٹھا تھا تو اس وقت خود بھی جوان رہا ہوگا پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عرصہ میں بنت بقیلہ تو شباب اور کہولت کی منزلیں طے کر کے ہشتاد سالہ عجوزہ بن گئی لیکن یہ شخص جوان ہی رہا جو اس جذبہ کے ساتھ اس کو حضرت خالدؓ سے طلب کرتا ہے اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ اس مدت میں بنت بقیلہ بڑھیا ہو چکی ہوگی، وہ اس کے متعلق یہ کہتی ضرور ہے کہ وہ شباب کو پایدار اور دوامی سمجھتا ہے لیکن کیا درحقیقت دنیا میں ایسا کوئی احمق ہے بھی۔

۵-اس شخص کو جب لوگوں نے سستے داموں بیچ دینے پر برا بھلا کہا تو اس نے کہا کہ میں ایک ہزار کے بعد بھی کوئی عدد ہے یہ جانتا ہی نہیں تھا، اس بات کو بھی آخر کون باور کر سکتا ہے، حضرت خالدؓ کی فوج میں کتنے مسلمان تھے؟ مال غنیمت کس کثیر مقدار اور تعداد میں مسلمانوں کے ہاتھ پڑ رہا تھا؟ کیا یہ سب چیزیں اس شخص کو معلوم نہیں تھیں اور اگر تھیں تو وہ ان کا شمار کس طرح کرتا تھا۔ (ص ۲۵۵ تا ۲۵۷)

ایک اور غلط روایت پر مولانا کی محققانہ بحث ملاحظہ ہو:

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے خمس میں سے رسول اللہؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا اور صرف تین حصے باقی رکھے تھے، مولانا اس روایت کو لغو اور غلط قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس کا راوی محمد بن سائب

کلبی محدثین کے نزدیک مجروح اور ناقابل اعتبار ہے، سفیان ثوری کا قول ہے "کلبی سے بچو" لوگوں نے کہا پھر آپ اس سے کیوں روایت کرتے ہیں؟ فرمایا میں اس کے جھوٹ سچ کی پرکھ رکھتا ہوں، یزید بن زریع نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت نقل کی تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا، حضرت اعمش نے یہ سن کر کہا کہ سبائیوں سے بچنا چاہیے، میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، لوگ ان کو کذاب کہتے ہیں۔

روایت زیر بحث کی اسناد ہے عن ابی صالح عن ابن عباس اور کلبی کی اس خاص اسناد کے متعلق ایمۂ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس اسناد سے جو روایت ہوگی وہ جھوٹی ہوگی خود سفیان فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مرتبہ کلبی نے کہا تھا کہ میں ابو صالح سے جو روایت بھی کروں گا وہ جھوٹی ہوگی، ابن عدی کا قول ہے "حدیث کے سلسلے میں کلبی سے بہت سی منکر احادیث مروی ہیں اور خاص طور پر وہ روایت جو ابن عباس سے بواسطہ ابو صالح مروی ہو"۔

حدیث کے علاوہ اس شخص کا تفسیر میں بھی یہی حال تھا، کسی نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا، کیا محمد بن سائب کلبی کی تفسیر دیکھنا جائز ہے، فرمایا نہیں۔ (ص ۳۴۹، ۳۵۰)

مولانا نے مورخین اور ارباب سیر کے بیان کی بے ترتیبی، پیچیدگی، الجھاؤ اور عدم تسلسل نیز کسی واقعے کو مناسب موقع و محل پر درج نہ کرنے کی شکایت کی ہے، اس سے تاریخ نگاری کے بلند مذاق اور اچھے سلیقۂ تحریر و تصنیف کا پتا چلتا ہے جیسے فتوحات شام کے بیان کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> "شام کی فتوحات سے متعلق مورخین کے بیانات بڑے مختلف اور پیچیدہ ہیں، حضرت ابو بکرؓ نے پہلا لشکر کب بھیجا اور وہ لشکر کون سا تھا؟ ان لشکروں کے امرا کون کون تھے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ایک نہیں ہے، طبری میں متعدد روایات ہیں جن سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں، بلاذری کے بیانات بہت بے ترتیب اور الجھے ہوئے ہیں جن سے ایک شخص کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتا، ان میں سے بعض بیانات طبری کی روایتوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور بعض ان کی بالکل ضد ہیں، ابو اسماعیل الازدی اور واقدی کے بیانات کا حال بھی یہی ہے، ابن اثیر، ابن خلدون اور عماد الدین بن کثیر

نے زیادہ تر طبری کی روایات کا ہی تتبع کیا ہے لیکن ہم نے ان سب مآخذ کو سامنے رکھ کر واقعات شام کو ایک خاص طرز پر مرتب کیا ہے جس سے واقعات میں تاریخی تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور منطقی ترتیب بھی قائم رہتی ہے''۔ (ص ۲۶۸)

ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں ہیں جو گانا نہیں جانتی تھیں لیکن لشتم پشتم ایک گیت گا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ سے چپ نہ رہا گیا بولے ''ارے رسول اللہؐ کے گھر میں یہ شیطانی گانے'' آنحضرتؐ منہ پھیرے لیٹے تھے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ کہتے سنا تو فرمایا ''اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے، آج یہ ہماری عید ہے''، مولانا سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

''بعض مصنفین نے اس واقعہ کو حضرت ابوبکرؓ کے تقویٰ کے واقعات کے ماتحت درج کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کا خیال آنحضرتؐ سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا، اصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس چیز کو ادب و احترام کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی لیے انہوں نے اس پر سخت الفاظ میں ناگواری خاطر کا اظہار کیا تھا''۔ (ص ۴۴۷، ۴۴۸)

مولانا نے خود ''ادب و احترام نبویؐ'' کے عنوان کے تحت اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

مستشرقین کے خیالات بھی کہیں کہیں زیر بحث آئے ہیں اور ان کی مدلل تردید و تغلیط کی گئی ہے، فتنہ ارتداد و بغاوت کا استیصال جس تیزی اور قوت کے ساتھ ہوا ہے یعنی ایک برس سے بھی کم مدت میں، اس پر مستشرقین کو سخت حیرت ہے، چنانچہ کیتانی کا خیال ہے کہ ان تمام جنگوں سے فراغت ایک سال میں نہیں بلکہ دو سال میں ہوئی ہوگی، مولانا سعید احمد صاحب فرماتے ہیں:

''تمام مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۲ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکرؓ نے شام و عراق کی مہم شروع کر دی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اندرون عرب استحکام و استقلال حاصل کیے بغیر وہ کسی اور طرف توجہ کرتے، اصل یہ ہے کہ حروب ارتداد کا ایک طویل سلسلہ، وسیع و عریض محاذ جنگ اور عرب قبایل کا تمرد و سرکشی، ان سب چیزوں کی وجہ سے کیتانی اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس محاذ جنگ کا قطعی فیصلہ ایک

برس کی قلیل مدت میں کیوں کر ہو گیا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ فتوحات عراق و شام کا سلسلہ بھی تو کافی دراز اور وسیع ہے اور پھر یہاں تو مقابلہ رومی و ایرانی اس وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں سے تھا، پس اگر حروب ارتداد کی انجام دہی میں دو برس لگے تو اس حساب سے عراق و شام میں بھی کم از کم دو ہی برس لگنے چاہئیں، حالاں کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت ہی کل سوا دو برس ہے اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ حروب ارتداد کے ساتھ فتوحات عراق و شام کی مہم بھی جاری ہو، پروفیسر فلپ ہٹی کی رائے میں ان تمام اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ صرف چھ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی ہو گیا تھا''۔ (ص ۲۳۳)

مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمان درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایران اور روم دو طاقت ور دشمنوں کے نرغے میں تھے جو اسلام کے لیے مستقل خطرہ اور عربی قومیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے، اس بنا پر ان کی سرکوبی نہ کی جاتی تو نہ اسلام کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا نہ عربی قومیت مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ عراق اور شام کے عرب قبایل کو ان دونوں حکومتوں کی غلامی اور ان کے حقارت آمیز برتاؤ سے نجات مل سکتی تھی، اس توجیہ سے وہ کہتے ہیں:

''ان یورپین مصنفین کی بھی تردید ہوتی ہے جو عراق و شام پر اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چوں کہ عرب طبعاً جنگ جو تھے اور حروب ارتداد سے فارغ ہونے کے بعد اندیشہ تھا کہ پھر کہیں اور کسی طرف سے بغاوت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے، اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو مشغول رکھنے کے لیے ان کا رخ ان ملکوں کی طرف پھیر دیا، واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ اقدام صرف اسی غرض سے تھا تو اس میں کوئی جان نہ تھی اور اس صورت میں مسلمان ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں سے بہ یک وقت ٹکرا سکتے ...... انصاف پسند یورپین مصنفین نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات کسی دنیوی لالچ اور طمع کا نتیجہ نہیں بلکہ اس اسپرٹ، بے خوفی اور بے جگری اور اس ڈسپلن کا نتیجہ تھیں جو اسلام نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا''۔ (۲۴۰، ۲۴۱)

آگے یورپ کے بعض انصاف پسند مورخین کے اعترافات نقل کیے گئے ہیں۔

فتوحات عراق وشام کے اسباب بیان کرتے ہوئے پہلے مغربی مصنفین نے اپنے مذاق کے مطابق جو لکھا ہے ان میں سے کچھ کو نقل کر کے ان کی تردید کی ہے لیکن ایک انصاف پسند کی طرح ان کے بعض تجزیوں کی تحسین بھی کی ہے، اسی سلسلے میں خود مسلمان مصنفین اور خاص طور پر قدیم طرز تعلیم کے حامل حضرات کا یہ خاصہ بتا کر اس کی تغلیط کی ہے کہ "اگر کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل مانتا ہے تو وہ چڑھ سے جاتے ہیں حالاں کہ خود صحابہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ نوآبادکاری میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونے میں اقتصادی وجوہ کو بڑا دخل ہوتا تھا"۔ (ص ۲۹۴)

بعض جگہ مولانا اصل ماخذ کی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے ہیں، طایف کے محاصرے کے دوران رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے اپنے اس خواب کا ذکر کیا کہ کسی نے مجھ کو ایک لبالب پیالہ نذر کیا لیکن ایک مرغے نے اس میں ٹھونگ ماردی اور جو کچھ پیالہ میں تھا وہ گر پڑا، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "اس خواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو اس محاصرے میں کامیابی نہیں ہوگی"، ارشاد ہوا "ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں"، مولانا نے طبری سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے:

> "کتاب میں غلطی سے آنحضرتؐ کا جواب وانا لا أری ذلک چھپ گیا ہے جس کے معنی "میں ایسا نہیں سمجھتا" ہیں حالاں کہ درحقیقت یہ لأری ہے جس کے معنی تاکید کے ساتھ اثبات کے ہیں، چنانچہ سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اس کو اسی طرح پڑھا ہے، دیکھو ازالۃ الخفا، ج ۲، ص ۱۶"۔ (ص ۵۰)

اس سے مولانا کی عربیت کے پختہ ذوق کا اندازا ہوتا ہے، عربیت میں بلند پایگی اور بلاغت شناسی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، حضرت ابوبکرؓ کے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن غزوۂ بدر تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قریش کی فوج کے ایک سپاہی وہ بھی تھے، انہوں نے میدان جنگ میں بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلے میں کون آتا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ خود تلوار کھینچ کر مقابلہ کو نکلے لیکن رحمت عالمؐ کو یہ گوارا نہ ہوا فوراً حضرت ابوبکرؓ کو روکا اور فرمایا:

متعنی بنفسک — تم ہمیں میرے پاس رہ کر مجھ کو فایدہ پہنچاؤ۔

مولانا اس ارشاد نبویؐ کی بلاغت کی طرف یہ لکھ کر توجہ دلاتے ہیں:

> "ذرا نطق مبارک کی بلاغت پر غور کرو، آنحضرتؐ کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بیٹے کے مقابلے میں جانے سے روکنا تھا لیکن چوں کہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے جوش حمایت میں جارہے تھے اس لیے ممکن تھا کہ اگر صرف سادہ طریقہ پر حضورؐ پر ان کو اس سے روکتے اور یہ فرماتے کہ نہیں تم ہمیں رہو تو ان پر اثر نہ ہوتا یا ہوتا مگر وہ بددلی محسوس کرتے، اس لیے آپؐ نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خود بہت اہم تھی یعنی حضورؐ کے پاس ہی رہ کر آپؐ کی حفاظت کرنا، اس لیے آپؐ نے متعنی بنفسک جس کے لفظی معنی ہیں "تم اپنی ذات سے مجھ کو فایدہ پہنچاتے رہو"۔ (حاشیہ ص ۳۶)

اسباب ووجوہ اور اسرار ومصالح کی وضاحت مولانا نے جابجا وجوہ واسباب اور اسرار ومصالح پر بھی بحث کی ہے، حضرت ابوبکرؓ کا لقب عتیق پڑنے کا سبب پہلے بیان ہو چکا ہے، ان کا دوسرا لقب صدیق تھا، بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے اس کی زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ معراج کے واقعے کی انہوں نے تصدیق کی تھی۔ (ص ۳)

ہجرت حبشہ کے بیان میں اس کے حکم ومصالح پر بھی اچھی بحث کی ہے، لکھتے ہیں "ہجرت کا یہ حکم اس لیے نہیں تھا کہ سرفروشان اسلام میں قریش کے مظالم کو سہنے کی طاقت نہیں رہی تھی بلکہ اس میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس بہانے اسلام کی دعوت دوسرے ملکوں میں پھیلے گی اور غالباً اسی وجہ سے مہاجرین کی فہرست میں ان ناموران قریش کے نام نظر آتے ہیں جو اپنی شخصیت، طرز گفتگو اور عقل وفہم سے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کر سکتے تھے، دوسری حکمت یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو یہ سبق دینا تھا کہ مسلمانوں پر اگر کہیں اس قدر ظلم کیا جائے کہ ان کو خدا کا نام لینے تک کی اجازت نہ ہو تو پھر بھی مسلمانوں کو وہیں نہ پڑا رہنا چاہیے بلکہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری محفوظ جگہ میں اپنی تنظیم کرنی اور قوت بڑھانی چاہیے"۔ (حاشیہ ص ۸)

اسی طرح عہدِ صدیقی میں جو مقامات فتح ہوئے ان کی اہمیت کے اسباب و وجوہ بتائے گئے ہیں، بحرین کے متعلق لکھتے ہیں:

"بعض خاص اعتبارات سے یہ جنگ یمامہ سے بھی زیادہ اہم تھی، یمامہ میں صرف ایک قوم اور ایک گروہ سے واسطہ تھا لیکن بحرین چوں کہ خلیج فارس پر واقع تھا، ایران کی حکومت کے ماتحت تھا اور یہاں ہندوستان اور ایران کے تاجر آباد تھے، جنھوں نے فرات کے دہانے سے عدن تک اپنی آبادیاں قائم کررکھی تھیں، اس بنا پر اسلام کی یہ جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں تھی بلکہ بین الاقوامی تھی اور پھر چوں کہ ان لوگوں میں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی، آتش پرست بھی تھے اور بت پرست بھی، اس لیے اس جنگ کو بین المذاہبی جنگ بھی کہہ سکتے ہیں، اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شان دار فتح ہوئی اور اثرات و نتائج کے علاوہ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں ایرانی حکومت نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تاروپود بکھر گیا اور مسلمانوں کے لیے عراق کی فتح کا راستہ کھل گیا۔" (ص ۲۲۶)

اسی طرح جنگ یمامہ وغیرہ کی اہمیت کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

کتاب کا یہ مطالعہ و تجزیہ بہت طویل ہوگیا مگر حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا، گوناگوں خوبیوں کو سمیٹ کر احاطۂ تحریر میں لانا بہت مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

مگر کسی مصنف کی ہر تحقیق و رائے سے اتفاق ضروری نہیں، اس لیے اب اس رخ کے بھی بعض جلوے دکھائے جاتے ہیں:۔

مولانا نے آنحضرتؐ سے حضرت ابوبکرؓ کی دوستی کے زیر عنوان لکھا ہے:

"حافظ ابن حجرؒ نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ ابوبکرؓ تو رسول اللہؐ پر بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد سے ہی ایمان لے آئے تھے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت ابوبکرؓ بھی سفر شام میں آنحضرتؐ کے ہم راہ تھے"۔ (ص ۴)

اس کے لیے مولانا نے اصابہ جلد ۲ حرف عین کا حوالہ دیا ہے مگر تلاش کے باوجود یہ ہم کو اس وقت نہیں مل سکا .... بحیرا راہب کا واقعہ تو یہ محققین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے اور جب رسول اللہؐ کی دعوت کا آغاز ہی اس وقت نہیں ہوا تھا اور سفر شام کے وقت آپؐ کی عمر تقریباً بارہ برس تھی اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ سے بھی دو برس چھوٹے تھے تو اس وقت ان کے ایمان لانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت بلالؓ کی ہم راہی بھی بالکل غیر محقق اور خلاف واقعہ امر ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبول اسلام کا تذکرہ کیا ہے، اس میں یہ بحث بھی کی ہے کہ سب سے پہلے کون اسلام لایا جس میں ایک خیال یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ کا اسلام حضرت ابوبکرؓ کے اسلام پر بھی مقدم ہے، یہ بحث ہمارے خیال میں غیر تشفی بخش ہے اور تعدد اقوال اور روایات کے الجھاؤ کی وجہ سے مولانا اپنا کوئی متعین خیال ظاہر نہیں کرسکے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا استحقاق خلافت کے عنوان سے جو باب قائم کیا گیا ہے، اس کی ایک ذیلی سرخی "حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر قرآن مجید میں" ہے، اس میں لکھا ہے کہ "تمام صحابہ کرام میں سب سے زیادہ یہ شرف اور سعادت حضرت ابوبکرؓ کو ہی حاصل ہے کہ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کو، آپ کے خاص خاص اعمال کو جن سے اسلام کو بڑا فائدہ پہنچا اور آپ کے عہد خلافت کے بعض نہایت شان دار کارناموں کو پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان پر مدح بھی کی ہے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کا قبل از بعثت جو دوستانہ تعلق تھا اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے"۔ (ص ۱۱۲)

ہمارے خیال میں یہ ساری باتیں غیر محقق ہیں اور مولانا نے اپنے دعوی کے ثبوت میں جو آیات نقل کی ہیں، ان میں سے بجز دو ایک کے کوئی حضرت ابوبکرؓ کے حق میں صریح و واضح نہیں ہیں، مفسرین شان نزول کے معاملے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں، رہیں تفسیری روایات تو مولانا نے واقعاتی حدیثوں کے قبول کے معاملے میں جو اصول بیان کیا ہے، ان کو ان آیات کے سلسلے میں مدنظر نہیں رکھا ہے اور نہ امام احمدؒ کے اس قول پر توجہ دی کہ ثلاثۃ کتب لا اصل لہا الخ۔

کتاب کا سب سے نازک مبحث حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت، خیبر اور باغ فدک کے مسئلے میں حضرت فاطمہؓ کی آزردگی ہے جس پر مولانا نے کئی جگہ بحث کی ہے، اولاً تو اس پر ایک ہی جگہ مفصل بحث ہونی چاہیے تھی اور دوسرے تمام زیر مقامات پر محض اسی کا حوالہ دے دینا کافی تھا، دوسرے ان کی یہ بحثیں پڑھ کر وہ مشہور مصرعہ یاد آجاتا ہے کہ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا
یہاں اس مسئلے پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہم دو تین امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ کے چھ ماہ تک بیعت نہ کرنے اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد بیعت کرنے کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں بھی ہے، مولانا نے اس پر درایتاً اور روایتاً متعدد اشکالات وارد کرکے مستدرک حاکم سے دو روایتیں نقل کی ہیں جن کے متعلق حاکم نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ صحیحین کی شرط پر ہیں لیکن شیخین نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، حاکم نے تو اپنی اکثر حدیثوں کے بارے میں یہی کہا ہے مگر اس کے باوجود اس میں ضعف بلکہ موضوع حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

مولانا صحیحین کا مرتبہ کتب حدیث میں سب سے اونچا مانتے ہیں مگر اس کے باوجود اس وقتی ضرورت کے تحت یہ فرماتے ہیں

> "یہ حکم بہ حیثیت مجموعی اور اکثریت کے اعتبار سے ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحیحین کی ہر روایت دوسری کتب حدیث کی ہر روایت سے زیادہ صحیح ہے، وجوہ قبول اگر غیر صحیحین کی روایت کے ساتھ زیادہ ہوں تو بے شک اس کو ترجیح ہونی چاہیے"۔ (مقدمہ ص ۲۲)

بلاشبہ یہ متاخرین حنفیہ کا مذہب ضرور ہے، انہوں نے یہ دیکھ کر کہ صحیحین کی مرویات کی زد ان کے مذہب پر پڑ رہی ہے تو انہوں نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح محض ان کی شروط کی وجہ سے ہے پس اگر کسی دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر اترتی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی مگر محقق محدثین اس کو درست نہیں سمجھتے، صحیحین کی ترجیح کی اصل وجہ شہرت اور قبول ہے۔

مولانا کے خیال میں مسئلہ زیر بحث میں وجوہ قبول صحیحین کی بہ جائے غیر صحیحین یعنی مستدرک حاکم کی روایت کے ساتھ زیادہ ہیں اور غالباً زیادہ اس لیے ہیں کہ اس سے وہ سارے

اشکالات رفع ہو جاتے ہیں جو انہوں نے وارد کیے تھے مگر ہمارے خیال میں اس کے باوجود بھی وہ باقی رہ جاتے ہیں، مولانا نے مستدرک کی روایت کے پیش نظر تطبیق کی صورت یہ نکالی ہے۔

"صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے، پہلی بیعت بیعت خلافت ہے جو آنحضرتؐ کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ کے موقع پر کی تھی اور دوسری بیعت بیعت رضا ہے جو آپ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد کی ہے، اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر سے خوشگوار کر لینا تھا۔"

گویا صلح صفائی پہلی بیعت کرنے کے بعد نہیں ہو سکی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری اور مستدرک دونوں کی روایتوں میں موجود ہے اور چھ ماہ کا عرصہ کشیدگی اور کبیدگی میں گزرا تو نتیجے کے لحاظ سے یہ اشکال کہ "کیا یہ چیز حضرت علیؓ کی بے نفسی اور پاک باز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے" نہیں رفع ہوا چاہے بیعت ایک ہو یا دو، مولانا کا ایک اشکال یہ بھی ہے کہ "اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں جو اہم واقعات وحوادث پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھے، حضرت علیؓ ان سب سے بے تعلق رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟" ہم کو اس سلسلے میں یہی عرض کرنا ہے کہ چاہے حضرت علیؓ نے ایک دفعہ بیعت کی ہو یا دو دفعہ روایت سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اس عرصے میں الگ تھلگ ہی رہے بلکہ دو دفعہ بیعت کرنے کی صورت میں مولانا کا اشکال اور قوی ہو جاتا ہے کہ دونوں میں شکر رنجی بھی رہی اور حضرت علیؓ الگ تھلگ بھی رہے، اسی لیے تو دوسری بیعت کی ضرورت پیش آئی۔

جب ایک بیعت ہو چکی تھی تو پھر دوسری بیعت کے کیا معنی؟ یہ تو مضحکہ خیز بات ہوئی۔

صحیح بخاری کی روایت چوں کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اس لیے مولانا نے پہلا سوال یہ قائم کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے تعلقات کس قسم کے تھے؟ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے، مولانا کے اصول کے مطابق چوں کہ راوی (عائشہؓ) اپنے تعلقات

صاحب واقعہ (علیؓ) سے پیچھے نہیں تھے اس لیے ان کی روایت بے اعتبار قرار پائے گی، حضرت عائشہؓ کا درجہ و مرتبہ نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کیا مولانا ہی کے الفاظ میں حضرت علیؓ کی بے نفس اور پاک باز و پاک طینت شخصیت کے یہ شایان شان ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ سے اپنے تعلقات خراب رکھیں۔

مولانا روایات کی تحقیق و تنقیح کرتے ہوئے ایک جگہ طبری اور یعقوبی جیسے مورخین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علیؓ کو مشتعل کرنا چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹ دیا، چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیانؓ نے حضرت علیؓ کو عار دلائی اور ان کو حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت پر براہیختہ کرنے کی غرض سے کہا یہ دیکھیے قریش میں جو گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے خلافت اس میں چلی گئی، خدا کی قسم اگر آپ اس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پاپیادہ فوج سے بھر دوں گا، حضرت علیؓ یہ سنتے ہی برہم ہو گئے اور بگڑ کر فرمایا، اے سفیان! تم اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن ہو، تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، ہم نے ابوبکرؓ کو خلافت کا اہل پایا ہے"۔

ایک اور روایت میں تو یہاں تک ہے کہ

"ابوسفیان نے حضرت علیؓ سے کہا، اپنا ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں آپ سے بیعت کر لوں لیکن حضرت علیؓ نے شدت کے ساتھ انکار فرمایا اور ابوسفیان کو جھڑک دیا"۔ (ص ۷۲، ۷۳)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ بنو امیہ میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جن کا آئینہ قلب گرد کدورت سے صاف نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے، عام مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اس سے بدگمانیاں پیدا ہوں گی، یہی وہ بدگمانیاں ہیں جن کا اثر روایات میں ظاہر ہے، ایک نکتہ شناس نفسیات معلوم کر سکتا ہے کہ ان روایات میں کتنی بات واقعی ہے اور کتنی وہ ہے جو اس طرح کی عام بدگمانیوں

سے پیش آتی تھی [illegible] اور خود سری سے آپ [illegible] واقف تھے"۔ (ص ۷۹)

حضرت ابوسفیان سے متعلق جو روایتیں نقل کی گئی ہیں وہ طبری و یعقوبی سے ماخوذ ہیں، ان سے صرف حضرت ابوسفیان ہی کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ خود حضرت علیؓ کے بارے میں بھی شک ہوتا ہے کہ ان کے احساسات کیا تھے؟ کس کی بنا پر ابوسفیان [illegible] جیسے لوگوں کو اس طرح کی باتیں کہنے کا حوصلہ ہوتا تھا اور بنو امیہ ہی کیوں [illegible] میں بھی بہت سے لوگ ایسے رہے ہوں گے۔

اہل سنت کے علما و محققین کا یہ مذہب معروف ہے کہ ان کے نزدیک نہ بنو امیہ کے گناہ باوجود اسلام یہدم ما کان قبلہ کے دھلے اور نہ ابوسفیان و امیر معاویہ طلقا کے زمرے سے نکل سکے، اس بحث کے آخر میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہی قول فیصل ہے، ملاحظہ ہو:

"حضرت علیؓ حضرت صدیق اکبرؓ سے بیعت کے معاملے میں عام مسلمانوں سے ذرا سب درجہ پیچھے رہے لیکن آگے چل کر جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے ان کا اثر روایات پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے ایک واقعہ کچھ تھا اور اختلاف تعبیر و ادا سے کچھ سے کچھ ہو گیا"۔ (ص ۸۳)

مولانا کے خیال کا اگر اعادہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ مسائل یا خرابیاں روایات پر انحصار کرنے کا نتیجہ ہیں اور روایات بھی کون؟ کتب حدیث کی نہیں تاریخ و مغازی و فتوح کی۔

حدیث قرطاس پر بھی مولانا کے بعض خیالات محتاج بحث و تنقیح ہیں اور مولانا شبلیؒ پر بعض جگہ جو نقد کیا ہے وہ بھی محل نظر ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے ان بحثوں کو قلم انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

کسی تحریر کی خوبی کے لیے حسن خیال و معنی ہی کی طرح حسن بیان و جدت ادا بھی ضروری ہے، مولانا کی کتاب میں یہ دونوں خوبیاں بہ درجہ اتم موجود ہیں، اس کتاب میں مولانا نے تاریخ و سیر ہی میں اپنی مہارت کے جوہر نہیں دکھائے ہیں بلکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر، حدیث اور فقہ و کلام میں بھی انہیں مکمل دست گاہ تھی۔

✿✿✿✿

میر عماد الدین محمود الٰہی الحسینی ہمدانی (۱)

از:- نور السعید اختر ☆

عہد مغلیہ کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اب بھی کچھ گوشے پردۂ خفا میں پڑا ہوا ہے، قدیم فارسی ادب کا بیشتر سرمایہ دنیا کے کونے کونے میں بکھرا پڑا ہے، اس لیے ان کی تلاش و جستجو اور حصول یابی آسان نہیں، علاوہ ازیں ان کے نقول کی فراہمی کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہوتا ہے، ہر کتب خانے کے الگ الگ اصول و ضوابط ہوتے ہیں، کہیں پر مخطوطات کے چند اجزا کا زیراکس دست یاب ہے تو کہیں پر اس کی مائکروفلم یا مائکروچپ تک رسائی ہے، مائکروفلم یا مائکروچپ کے مقابلے زیراکس کا پڑھ لینا نہایت آسان ہے، مائکروفلم کے لیے ریڈر درکار ہوتا ہے جس کی سہولت ہر لائبریری میں نہیں ہے، اجرت کی بھگتان کا مسئلہ علاحدہ ہوتا ہے، ان تمام دشواریوں کے باوجود راقم نے دیوان الٰہی اور تذکرۂ خزینۂ گنج کی مائکروچپ حاصل کرلی اور برسوں کی امیدوں کے چراغ روشن ہوگئے۔

اس سے قبل کہ میر الٰہی کے حیات اور افکار پر روشنی ڈالی جائے ہماری نظر تذکرہ الٰہی (خزینۂ گنج) کے ابتدائی صفحے پر پڑتی ہے جس کے بائیں طرف تذکرۂ شعرا اور اس کے بازو میں تذکرۂ الٰہی مرقوم ہے اور اس صفحے کے اختتام سے قبل برلن لائبریری جرمنی کی گول مہر لگی ہوئی ہے، سیدھی طرف ایک رباعی اور بقیہ اشعار ہیں جو ترچھے لکھے ہوئے ہیں اور بہ مشکل پڑھے جاسکتے ہیں، اشعار کے بعد کی عبارت ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخطوطہ معارف پرور، ادب نواز مغلیہ بادشاہ بیگم نور جہاں

(۱) مولف تذکرہ روز روشن، اصفہانی، صاحب عرفات العاشقین اور ان کی تقلید میں مجمع النفائس کے مولف نے الٰہی کو "اسد آبادی" لکھا ہے۔

☆ ... ۱۰۷، اندھیری ایسٹ ممبئی ۹۳۔

کی نیز بی بی صفاہانی کی نگرانی میں تھا جو دربار شاہی میں کتابت کے فن میں یکتا ہوتی تھیں، چنانچہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

بی لالی صفاہانی ... نوکر نور جہاں بیگم بودہ، چو کاتب درگاہ بادشاہ بود

ظاہر ہے کہ بادشاہ بیگم کے شاہی کتب خانے کا کتاب دار کسی مرد کا ہونا خلاف قیاس ہے، ڈاکٹر اشپرنگر اور ڈاکٹر اسٹورے نے اس امر کی طرف توجہ کیوں مبذول نہیں کی ممکن ہے ان لوگوں نے اس عبارت کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یا قصداً اس کی طرف توجہ نہیں کی، بہرکیف اس حقیقت کے پیش نظر اس مخطوطے کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

تذکرہ الٰہی (خزینۂ گنج) کے ساتھ برلن لائبریری نے دیوان الٰہی کا ناقص الطرفین دیوان بھی راقم کو بھیج دیا، ذیل میں تذکرہ الٰہی اور دیوان الٰہی کے دست یاب مخطوطات کی تفصیلات دی جارہی ہیں

۱- تذکرۂ الٰہی (خزینۂ گنج): مملوکہ برلن لائبریری کیٹلاگ از اسٹوری ص ۶۴۲، ۱/۱-۸۱۶ص۔

۲- تذکرۂ الٰہی (خزینۂ گنج)، متعارف کردہ از پروفیسر عبد الحق، معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۷۴ء۔

یہ نسخہ کچھ عرصے کے لیے ڈاکٹر حق کی ذاتی ملکیت میں تھا، ۲ جلدیں مکمل مقدمہ ندارد۔

۱- دیوان الٰہی برلن لائبریری برلن، جرمنی، ش ۹۳۹، ۱۰۵۲ھ فہرست اشپرنگر (اودھ کیٹلاگ) ش ۲۷۷؟۔

۲- دیوان الٰہی: رام پور، شمارہ ۳۴۸۷، فہرست مخطوطات فارسی، صولت لائبریری ردیف، کتاب خانہ ۵۵۶ م، میر عماد الدین محمود بن حجۃ اللہ الٰہی ہمدانی (اسد آبادی) معروف بہ "میر الٰہی" متوفی (در تاریخ کشمیر) ۱۰۴۳ھ؟

۳- دیوان الٰہی: فہرست مخطوطات فارسی مرتبہ ریو، جلد ۲، ص ۶۹۷ ب، برٹش میوزیم، نمبر ۲۵۳۳۰، کل صفحات ۱۹۶، مرقومہ ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء۔

اب ہم ان کے دست یاب حالات پیش کرتے ہیں:

میر عماد الدین محمود الٰہی، الحسینی، ان نابغۂ روزگار برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن کی قدر ومنزلت مغل بادشاہوں، حاکموں اور صوبہ داروں نے ہاتھوں ہاتھ کی، میر الٰہی کے والد امیر حجۃ اللہ کا تعلق ہمدان اور کردستان کے درمیان واقع ایک موضع ''اسعد آباد'' کے حسینی سادات سے تھا، اسی مناسبت سے الٰہی اپنے نام کے ساتھ ''الحسینی'' کا اضافہ کرتے ہیں:

''ایں تذکرۂ الٰہی عماد الدین محمود الٰہی الحسینی مطلع شیخ رافرمودہ، شنیدہ ام از تذکرۂ الٰہی''۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے الٰہی کی شہرت کو ان کے تخلص پر محمول کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، الٰہی کا دیوان اور ان کا تذکرہ ان کی شہرت کے ضامن ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

ہست عمر حسن مردی شد دیوان ما، انتخاب جملہ دیوانہا ست دیوان ما

الٰہی کے ہم عصر تذکرہ نویسوں نے انہیں ''اسعد آبادی'' قرار دیا ہے لیکن الٰہی نے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ ان کا تعلق ہمدان سے ہے، کہتے ہیں:

از دوری ہمدان می طپد دلم ہر چند کہ سینہ ام ہمدان دل چوں کوہ الوند است (۱) ''مولف ایں تذکرہ الٰہی الحسینی الہمدانی'' (تذکرۂ الٰہی ص ۸۰ در ذکر سلمان ساوجی)

تقی اوحدی نے انہیں عین جوانی میں دیکھا تھا، اوحدی، میر الٰہی کی ''دقت طبع'' اور ''ادراک عالی'' کا معترف تھا، چنانچہ بہ الفاظ اوحدی ''الحق جوانیست در غایت دقت طبع و ادراک عالی''۔ (عرفات العاشقین ص)

حصول تعلیم کی خاطر الٰہی عنفوان شباب میں شیراز پہنچے اور وہاں ساڑھے تین سال تک شاہ داعی کی خانقاہ میں تحصیل و معارف کا درس حاصل کرتے رہے، یہاں کی متبرک مزارات کے طواف سے روحانی فیض حاصل کیا، اسی خانقاہ کے حجرے میں انہوں نے ایرانی شعرا کے دواوین سے انتخاب تیار کرنا شروع کیا، غالباً الٰہی نے تذکرے کی تالیف کا ڈول یہیں سے ڈال دیا تھا، چنانچہ خود لکھتے ہیں

''صاحب ایں تذکرۂ الٰہی در سال ہزار و دہ ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱ء بطلب علم و کمال بشیراز رفتہ بود سہ و نیم سال تحصیل معارف در آں خطۂ پاک نمودہ، بطوف مزارات

(۱) از دیوان الٰہی

متبرکہ [illegible] راشین [illegible] دیوان [illegible]
بقدر انتخاب نمودہ، یعنی منتخبات [illegible] غزلیات،
قصاید، مثنویات [illegible] بیست ہزار بیت شدہ اند۔ (ص ۲۲ تذکرۂ الٰہی)

تحصیل علم کے اکتساب میں الٰہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''مولف ایں تذکرہ ہمداں زمان در شیراز تحصیل علم نمودی و کوکب ما استقبال و اجتماعی [illegible]'' (ص ۹۶ تذکرۂ الٰہی در ذکر رشاد [illegible])

تذکرۂ عرفات العاشقین کے مولف تقی اوحدی کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ الٰہی شیراز میں زیور علم سے آراستہ ہو کر مزید دانش و فراست کے حصول کے لیے پہلے عراق اور بعد ازاں شاہ عباس اول کے عہد میں اصفہان پہنچے اور وہاں دو سال تک قیام پذیر رہے، ہندوستان میں تحفظ جان اور ایرانی شعرا کی شاہانہ سرپرستی اور قدر دانی دیکھ کر الٰہی کو ترک وطن پر مجبور کیا، الٰہی کہتے ہیں:

''از حرص مال مایل ہندوستان شدم، ویں مستدل سیہ جگرم خوردہ خمرہ وار''۔

اس لیے الٰہی جان بچا کر ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء میں قندھار (افغانستان) پہنچے اور یہاں مرشد بروجردی کی وساطت سے قندھار کے صوبہ دار میرزا غازی ترخان سے عنفوان جوانی میں متعارف ہوئے، میرزا غازی نے الٰہی کو ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر کسی عہدے پر اپنی ملازمت میں داخل کرلیا، عبدالباقی نہاوندی نے اس امر کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ''در ایام سلطنت قندھار میرزا غازی [illegible] اکثری از مستعدان ایران مثل میر الٰہی اسعد آبادی و دیگر مستعدان ایران بشرف ملازمت آں بختیار رسیدند''۔

الٰہی کی قسمت کا ستارہ بام عروج پر تھا، ۱۰۲۱ھ میں میرزا غازی بیگ ترخاں کا اچانک انتقال ہوگیا، الٰہی نے کابل کا رخ کیا یہاں ان کی ملاقات حکیم حاذق گیلانی سے ہوئی جو حاکم بخارا امام قلی خان کے دربار سے سفارت کی خدمات سے سبکدوش ہو کر لوٹ رہے تھے، میر الٰہی سے حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی لیکن وہ ان کی انا سے ناخوش ہوئے، الٰہی نے فوراً طنزاً ایک رباعی کہی جس میں حکیم حاذق کا خاکہ اڑایا ہے ؎

دائم ز ادب، سنگ سبو نتواں شد ... در دیدۂ اختلاط، مو نتواں شد

صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست با شعر خبط روبرو نتواں شد

مولف بادشاہ نامہ محمد صالح کا بیان کسی تسامح کا شکار نظر آتا ہے، وہ رقم طراز ہے کہ "الٰہی درسنہ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء با حکیم حاذق ملاقات کرد"۔ (جلد ا، ص ۳۱۸)

حکیم حاذق سے ملاقات کے ایک سال بعد یعنی ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں الٰہی کابل سے آگرہ پہنچے، تذکرۂ عرفات کے مولف تقی اوحدی سے میر الٰہی کی ملاقات اسی سال آگرہ میں ہوئی تھی، اوحدی نے اس ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"وقتی در آگرہ باہم بودیم، وی ہم در آن حوالی بود"۔ (۱۲۲-۱۲۳ بحوالہ آقای گلچین معانی)

الٰہی آگرہ میں بہ مشکل تین برس رہے ہوں گے کہ انہیں کابل لوٹنا پڑا، الٰہی دو سال تک (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء تا ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) صوبہ دار کابل مہابت خان سے منسلک رہے، اس امر کی طرف اوحدی کا اشارہ دیکھیے:

"و حالی در ملازمت مہابت خان می باشد"۔ (۱۲۲-۱۲۳، گلچین معانی)

یہاں الٰہی کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، الٰہی نے دوبارہ آگرہ کا رخ کیا اور اپنے شاعرانہ وقار کے پیش نظر شہنشاہ جہاں گیر کے دربار میں رسائی پیدا کرلی، غالباً اسی زمانے میں خالص سونے کا سکہ جہاں گیر کے نام کے ساتھ شاہی ٹکسال سے نکالا گیا، الٰہی نے ایک قطعہ میں اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

سکہ چوں زیب نام او برداشت بر زر سرخ آفتاب زدند
از جہاں خسروان گزیدندش انتخاب بر انتخاب زدند
پادشاہ زمانہ نور الدین کو جہاں گر شد تیغ و نگیں (ص ۱۳۹، دیوان الٰہی، برلن)

یہ بہت ممکن ہے کہ معارف پرور، ادب نواز ملکہ نور جہاں کی سرپرستی بھی حاصل رہی ہو، زیر نظر تذکرۂ الٰہی کا مخطوطہ پادشاہ بیگم نور جہاں کی کنیز اور شاہی کاتب لالی اصفہانی کی تحویل میں تھا۔ (دیکھیے تذکرۂ الٰہی کے سرورق پر تحریر کردہ نوٹ)

صوبہ دار مہابت خان کے قندھار سے چلے جانے کے بعد الٰہی نے شاہی امرا سے

روابط استوار کیے اور ان کی زوردار سفارشات سے شاہی تقرب کی راہ ہموار کی، اسی دوران یعنی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء کے مابین بے تکلف ہم نشینوں کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کا ذکر الٰہی نے اپنے تذکرے میں مولانا آگہی کے بیان کے دوران صفحہ نمبر ۲۲ ب پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"چنانچہ وقتی مولف ایں تذکرۂ الٰہی در ... ہندوستان با جلیس نشستہ بود و شیشۂ صہبا پر پری ایست، و وقت ب عمل از پیش خستہ نگاہ از حتی بیخند ساقی خو نمودہ ختم، کہ روزگاری سالہ بر من بہ گذر، ہرگز دستم بہ پیمانہ آشنا نبود، امروز بتقاضای مشرب اہل ہندوستان الاکیش افتادہ ام و عمری بیہودہ می گزارم"۔ (ماخوذ تذکرۂ الٰہی)

میر الٰہی کے مندرجہ بالا بیان اور دیگر شواہد کی روشنی میں میر الٰہی کے سال پیدائش کا تعین بڑی حد تک ممکن ہوگیا ہے۔

میرزا غازی ترخان صوبہ دار قندھار کے انتقال دو سال بعد یعنی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں مہابت خان کی کشمیر سے آگرہ کو واپسی پر الٰہی نے بھی آگرہ کا رخ کیا، الٰہی کو بہت جلد شاہی تقرب حاصل ہوگیا، ہندوستانی بلانوش دوستوں کی محفل میں الٰہی نے تیس سال کی عمر میں پہلی بار شراب کا پیالہ منہ سے لگایا، بہ قول الٰہی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں ان کی عمر تیس برس کی تھی، اگر ہم ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء سے تیس سال گھٹا دیتے ہیں تو الٰہی کا سال پیدائش نکل آئے گا، ہمارے اندازے کے بہ موجب الٰہی ۹۹۴ھ/۱۵۸۵ء کے آس پاس پیدا ہوئے اور غنی کشمیری کے تاریخی مادے کے مطابق "بود سخن آفرین" تک بقید حیات رہے، گویا الٰہی کی طبعی عمر ۷۰ برس کی تھی، ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء لیکن ڈاکٹر عبدالحق (۱) کے تحقیقی بیان کے مطابق الٰہی ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء تک زندہ رہے، ایسی صورت میں الٰہی کی طبعی عمر میں ایک سال کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

جہاں گیر کے انتقال کے بعد ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء میں شاہ جہاں نے ظفر خان احسن کو کشمیر روانہ کیا تھا، مغلیہ سلطنت کے قوانین کے مطابق کسی اہم عہدے پر تقرر کے وقت مقامی لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کی ضمانت دینی لازمی تھی، دربار میں میر الٰہی حاضر تھے، انہوں نے فی البدیہ کہا "خدا ضامن و رسول و چار یارش"۔

(۱) مقالہ "تذکرۂ الٰہی" "خزینۂ گنج" از ڈاکٹر عبدالحق، معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء، اعظم گڈھ۔

بادشاہ کو الٰہی کا استدلال پسند آیا، ظفر خان احسن جیسے علم پرور، معارف نواز امیر کو بھی یہ بات بھا گئی، بادشاہ سے عرض کرکے الٰہی کو اپنے ساتھ کشمیر لے گئے، جہاں پر احسن کو ان کے والد خواجہ ابوالحسن تربتی کا نائب بنایا گیا تھا، خواجہ ابوالحسن تربتی کا ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں انتقال ہوا، یہ شاہ جہاں کی حکومت کا پانچواں سال تھا۔

اپنے والد کے بعد ظفر خان احسن طویل عرصے تک کشمیر کا صوبہ دار رہا، الٰہی نے احسن کی ادب نوازی اور رعایا پروری اور دیگر فتحانہ کارناموں کو بہ ذاتِ خود دیکھا، بالآخر احسن کو ٹھٹے بھیج دیا گیا جہاں ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء (۱) میں احسن کا انتقال ہو گیا، ٹھٹھہ (سندھ) نزد کراچی میں ان کا شاندار مقبرہ ہے۔

ایک مرتبہ ظفر خان احسن کو کشمیر کی صوبہ داری سے معزول کر دیا گیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد دوبارہ وہاں کا تقرر ہو گیا، اس کے بعد انہیں ٹھٹھہ (سندھ) کا صوبہ دار بنا دیا گیا، احسن نے آخری سانس تک اپنے فرائض بہ خوبی انجام دیے، سرکشوں کی سرکوبی کی، ہر طرح سے امن و امان برقرار رکھا، میر الٰہی نے اپنے مربی کا ہر حال میں ساتھ نہیں چھوڑا، احسن کی جنگی فتوحات اور ادبی کارگذاریوں پر پُرشکوہ قصیدے کہے، احسن اور دیگر امرا کی قدر دانیوں کو خوب سراہا، کشمیر کی نشاط انگیز فضاؤں، مرغزاروں اور پھولوں سے بھری وادیوں میں گنگناتے ہوئے حیات بخش چشموں کے کنارے شعر سخن کی محفلیں آراستہ کیں، شعر و شاعری کے معیار کو بلند تر مقام بخشا اور خود بھی ان عرفانی محفلوں کی شمع فروزاں بنے رہے، اسی جنت نشان خطے میں دارِ فانی کو لبیک کہا اور اسی فردوس بریں کی خاک میں مدفون ہوئے۔

تاریخ اعظمی کے مولف نے اطلاع دی ہے کہ:

"میر الٰہی در احاطۂ مقبرۂ شیخ بہاءالدین جانب غرب مقبرۂ ایشان مدفن یافتہ

وسنگی بر بالین قبرش ایستادہ است، این کتبہ دارد

میر الٰہی ملک ملک نظم بود در اقلیم سخن بے قرین سال وفاتش طلبیدم ز عقل

گفت بگو: "بُد سخن آفرین" - ۱۰۶۳ھ

(۱) [illegible] خان۔

مولف "سرو آزاد" اور بلبل کشمیر غنی کی کہی ہوئی تاریخیں زیادہ معتبر ہیں، غنی کشمیری نے الٰہی کے رحلت کی تاریخ ان الفاظ میں کہی ہے:

مادہ تاریخ:- "بود سخن آفرین" ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳ء)

خلاصۃ الافکار از ابو طالب کا کہا ہوا مادہ تاریخ جس سے میر الٰہی کا سال وفات ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء برآمد ہوتا ہے اور مرأت جہان نما میں پایا جانے والا سال وفات ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء صحیح نہیں ہیں، سراج الدین علی آرزو نے بھی الٰہی کی تاریخ وفات نظم کی ہے جس سے ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۳ء برآمد ہوتے ہیں (تذکرہ نتائج الافکار اور شمع انجمن میں بھی یہی سال ۱۰۶۴ھ درج ہے)۔

ڈاکٹر پروفیسر عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی کو "تذکرۂ الٰہی" کا مکمل قلمی نسخہ کسی جون پور والے صاحب کی معرفت ملا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس نسخہ کا تعارف معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں کرایا تھا، ڈاکٹر صاحب کا ادعا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے جو ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۶۵۴ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا تھا، نسخے کے ترقیمہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے

"تمام شد این دفتر اول از تذکرہ الٰہی کہ در ذکر حقد من شعرای علیین مکان را دو شنبہ ماہ شوال بتاریخ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء ہزار و شصت و پنج و مولف این تذکرہ الٰہی عمادالدین محمود المتخلص بہ الٰہی حسینی ابن امیر حجۃ اللہ حسینی اسعد آبادی الہمدانی است"۔

(معارف، اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۱۰)

ڈاکٹر عبدالحق سے رابطہ قایم کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک جون پوری صاحب اسے سرحد پار لے کر چلے گئے، کاش ڈاکٹر صاحب نے کم از کم اس کا زیراکس ہی محفوظ کر لیا ہوتا، ان حالات میں ان کے مقالے کے پس منظر میں کوئی مستند رائے نہیں قایم کی جا سکتی ہے۔

سید حسام الدین راشدی نے الٰہی کے مشہور باغ کی بابت یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ "الٰہی نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں کشمیر میں نوشہرے کے جنوب میں "باغ الٰہی" کے نام سے ایک باغ بنوایا تھا، ظفر خان احسن کے علاوہ کئی اور شعرا نے بھی اس باغ کی تعریف کی ہے، ظفر خان نے تعریف میں بہت سے شعر کہے ہیں، یہ شعر بھی لکھا ہے:

یکی از باغہا، باغ الٰہی است کہ رضوان را ز شکش چہرہ کاہی است

دران گلشن یکی کہنہ چنار است زنخلِ طور، گوئی یادگار است(۱)

یہ باغ اس کہنہ چنار کی وجہ سے "باغ چنار" کے نام سے بھی مشہور ہے، کسی شاعر نے یوں تاریخ نکالی ہے:

گریبان میکشد، خواہی نخواہی بسوی خود، مرا، باغ الٰہی

فلک آشفتہ بود از بہر سالش ملک گفتا، بگو، باغ الالٰہی ۱۰۰۵ھ

میر الٰہی اشعار کے پس منظر میں میر الٰہی نے ایک قصیدے میں اپنے ذاتی حالات کی ترجمانی کی ہے، ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی نے زمانے کے سرد و گرم سے کس طرح نبرد آزمائی کی تھی، وہ خود کو مارِ گنج سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حالاں کہ مارِ گنج گوشہ نشین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس جستن دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت کی ساخت و پرداخت بالکل علاحدہ طریقہ سے ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور مزاج میں سات دنیاؤں اور ہفت آسمانوں کا تجربہ موجود ہے، لہٰذا ان کی ذات کا ہر ایک حصہ ہفت پہلوی اوصاف کا حامل ہے، الٰہی کبھی تنگیِ روزگار کا گلہ کرتے ہیں تو کبھی تلاشِ معاش کا دکھڑا بیان کرتے ہیں، آئے دن کی تلخیوں کو سہتے سہتے وہ مزاجاً تشکین ہو جاتے ہیں اور تڑپ کر کہتے ہیں کہ ان کے پاس ستم ہائے روزگار کا علاج، خونِ دل پینے کے سوا کوئی اور نہیں ہے، حالات نے انہیں سنگ دل ضرور بنا دیا ہے مگر اصل میں وہ گوہر سے بھی زیادہ نرم و نازک ہیں، آخر میں اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ عشق نے ان کو نہایت لاغر و کم زور بنا دیا ہے، وہ مبالغہ کی حد تک بے وزن ہو گئے ہیں، نقاہت کے باعث ان کا بدن کپڑوں سے باہر آ گیا ہے، نقاش کے لیے ان کے لاغر بدن کی تصویر بنانا بہت آسان ہو گیا ہے، اس کے باوجود بھی وہ باہمت رہے اور فلک کی رفتار کا مقابلہ کرتے رہے، یہ صرف اس لیے کہ الٰہی خود کو ظالم آسمان سے بدرجہا قوی تر سمجھتے ہیں، مندرجہ بالا خیالات، جذبات اور احساسات کی نمایندگی کرنے والے اشعار ملاحظہ کیجیے:

چوں مارِ گنج گوشہ نشیں توانگرم اندیشہ مہرۂ مار است، در سرم

دنیائے دیگرم بحقیقت کہ دادہ اند تربیت ہفت کشورم ہفت پیکرم

بر سینہ و کنار من ایں قلبہای داغ دینا زر شد از نفس کیمیا گرم

(۱) ترخان، راشدی، ص۱۹۹

چوں تاج در سرشت بود قدیم دلے چوں تیغ زاج تازدہ مختلف جوہرم

گرداب آبشست مرا کشتی مراد بال سمندرست دریں ورطہ لنگرم

چوں گور کافرست بمن غبارِ دہر روز و شب زمانہ بکثرت منکرم

چرخ سیہ کاسۂ دون کے دہد خورش جز شیر مرغ و بیضہ سنگین کبوترم

کردم بسی شکایتی از تنگی معاش شد خونِ دل اضافۂ رزقِ مقدرم

آخر شدم ز سنگ دلی رفتہ رفتہ سنگ از جنس مرمرست مگر است گوہرم

بخت سیاہ بر سر بستاں خویش داشت از شہر می برید بطفلی چو مادرم

من از گرسنہ چشمے طفلانہ کہ بود آن شیر بر مکیدم و شد روح پرورم

آمیختہ بہ بختِ سیاہست ایں زماں شیر سفید گر رہے از حوض کوثرم

بمیانہ بر نشستہ بشاخ درختِ عمر بسنگیِ از رو عصیان ہمی برم

زخم مشکست و عشق چناں ساخت لاغرم کز رنگ خویش ہم بکہ وزن کمترم

تشریح تن کند ز برون سوی پیرہن نقاش در نگارش تصویر لاغرم

اربابِ ہمتم نکبد آسمان خیال کز آسمان ہزار فلک وار برترم

میر الٰہی ایک جگہ کہتے ہیں کہ ان کے حالات ناسازگار اور ناگفتہ بہ ہیں، بہتر ہے یہ در پردہ رہیں تاکہ انہیں اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے، دراصل الٰہی کو اپنی بدقسمتی سے شکایت ہے، چنانچہ اس کے اعتراف میں کہتے ہیں ؎

حدیث من بجگر خواری آسا است مپرس ہماں بہ است کہ در پردہ ماند ایں احوال

کدام قصۂ من زو در سراچۂ گوش کہ گریہ از تہِ دل نایدش باستقبال

مرا شکایتے از طالع است خواہم گفت پس از بمدتِ بخاب بارگاہِ جلال

الٰہی کے تعلّی آمیز اشعار میر الٰہی کے تعلّی آمیز اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہیں اپنے اشعار کلامِ بلاغت نظام پر فخر تھا، وہ اپنے کلام کو خلاق معانی کی شان تصور کرتے اور دیوان کو اساتذہ کے جملہ دواوین پر ترجیح دیتے، نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے بیش بہا ہونے کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ما از ہمہ کس بیش بہایم الٰہی در شہر اگر مردم بیکار فرو شند

الٰہی خود کو طبعاً دریا ضمیر تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

منم آن الٰہی دریا ضمیر کز طبعم گہر لبالب دریا سحاب کرد دام

اپنے لقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جمال الدین جہان لقب الٰہی را چو بہر خلقِ معانی کمالِ شان آید

اپنے کلام بلاغت نظام کی توصیف میں کہتے ہیں:

بست نظم حسن ماروی شما دیوانِ ما انتخاب جملہ دیوانہاست دیوانِ ما

لحن بلبل کی طرح چہکنے والا الٰہی کہتا ہے:

این منم چوں لحنِ بلبل دست بر دستِ بساط واں توئی چوں جلوہ گل دوش بر دوشِ کمال

کشمیر، میر الٰہی کی نظر میں میر الٰہی نے ایک قصیدہ ظفر خان احسن کی معرکہ آرائیوں اور جنگی فتوحات کی توصیف میں کہا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ کشمیر میں ساری رعنائیاں، بہاریں ظفر خان احسن کی مرہون منت ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

افراخت علم نور مہ بخت بر تقدیر گل کرد زمینان ظفر طالعِ کشمیر

فردوس چوں پرداختہ از کفِ تقدیر گردید جگر گوشہ ہا او گوشۂ کشمیر

خار از رطوبت شدہ چنداں بنزاکت کور اشکند کوہکن از تیشۂ تصویر

فردوس بمدح گر کشمیر حلال است گر خس پنہانش نمک دادۂ تقریر

یعنی کہ دریں بوم چو گل کرد بہاری اسبب خزانش نرسد چو گل تصویر

از فیضِ دمادم کہ بکشمیر مہیا است ہست از قدم خان ظفریاب عدو گیر

لشکر شکن معرکہ آرای ظفر خان کز تیرہ دل خارہ کند چوں رخ کفگیر

الٰہی بہ حیثیت شاعر شہنشاہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے سربرآوردہ شعرا میں میر الٰہی کا شمار ہوتا ہے، تذکرہ نگاروں نے الٰہی کو ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، حالاں کہ الٰہی کے تذکرے کے سلسلے میں خاموش رہے، الٰہی نے بھی تذکرے میں ذاتی حالات نہیں لکھے، تین سو پچاس صفحات پر منحصر تذکرے میں صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں الٰہی نے اپنی ذات سے متعلق ہلکے اشارے

کیے ہیں، ممکن ہے تذکرے کی دوسری جلد میں الٰہی نے اس کی کوشش کی ہو، افسوس ہے کہ تذکرے کی دوسری جلد ہماری دست رس سے باہر ہے

"تمام شد ایں دفتر اول از تذکرہ الٰہی کہ در ذکر حقد مین شعرا علیین مکان را"۔

ترقیمہ نسخۂ تذکرۂ الٰہی بحوالہ معارف، اکتوبر ۱۹۷۴ء، مقالہ ڈاکٹر عبدالحق

الٰہی کو چند سال سے زیادہ شاہی ہمنشینی میسر نہیں آئی، مہابت خاں صوبہ دار کابل اور ظفر خان احسن صوبہ دار کشمیر اور میرزا غازی بیگ ترخان اور دیگر امرائے قندھار و کشمیر کے پاس ان کا بیشتر وقت گزرا، الٰہی کی شاعری کا اثاثہ پنچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کی تعریف میں الٰہی کے رقیب اور ہم عصر یکساں رطب اللسان ہیں، مولف سخن سرایان ایران کا بیان ہے کہ:

"دیوان (الٰہی) ہندوستان میں خاص طور پر مشہور رہا"۔ بحوالہ ترخان، ص ۱۹۹،

از راشدی

سید حسام الدین راشدی تذکرہ مجمع النفائس کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ "طغرای مشہدی نے کسی معاصر شاعر کو ہجو کیے بغیر نہیں چھوڑا مگر میر الٰہی کا اپنے رسالے میں جب حال لکھا تو بڑے ادب و احترام سے"۔ (بحوالہ تذکرہ شعرائے کشمیر، از راشدی، ص ۱۲۰۰)

سید حسام الدین راشدی میر الٰہی کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"ان کی شاعری اور اشعار کی تمام تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شاعر نازک مزاج اور خوش خیال تھے، درستیِ مضمون، زبردستی زبان اور تازگی خیال حاصل تھی، نزاکت، استعارہ اور تازہ گوئی میں کامل تھے اور ساتھ ہی خوش خلق اور درویش مزاج بھی تھے"۔ (تذکرہ شعرائے کشمیر، از راشدی، ص ۱۲۰۰)

کشمیر کی فرحت بخش فضا اور حاکموں کا مسلک کسی حد تک ایرانی ماحول کے متبادل تھا، شاید اسی لیے الٰہی نے پایہ تخت آگرہ سے کنارہ کشی کو فوقیت دی، ممکن ہے شاہی دربار کے نامی گرامی شعرا صائب، عرفی، نظیری اور کلیم کے سامنے الٰہی کی شمع سخن ماند پڑتی ہو، ورنہ دربار شاہی میں داد و دہش کی کوئی کمی نہیں تھی، کشمیر میں الٰہی کے ہم عصر شعرا کی فہرست میں مولف تذکرۂ مآثر رحیمی نے، ملا شکوہی ہمدانی، آقای رضی، طالب آملی، محوی اردبیلی، حکیم شفائی، سروری یزدی،

ظفر خان احسن کے اسمائے گرامی دیے ہیں۔

الٰہی ہمدانی صوبہ دار کشمیر ظفر خان احسن کے نام ور شعرا کی کہکشاں میں روشن ستارہ کی مانند تھے، احسن کی محفل شعر و ادب میں کلام الٰہی کی آب و تاب سب سے جداگانہ تھی، یہ بات اور ہے کہ طالب آملی کو ۱۰۲۸ھ میں جہاں گیر نے ملک الشعرا کے خطاب سے نواز دیا تھا۔

میر الٰہی کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے ان کے شاعرانہ محاسن کو سراہا ہے، بالخصوص تقی اوحدی اور محمد صالح کنبوہی (لاہوری) نے الٰہی کے کلام کی شاعرانہ خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی فصاحت و بلاغت اور تفکر شعر کا ذمہ دار ذیل کے نکات کو قرار دیا ہے جن سے الٰہی کا کلام آراستہ و پیراستہ ہے، تقی اوحدی نے مندرجہ نکات کی نشان دہی کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

۱- دقت طبع ۲- ادراک عالی ۳- کمال شوخیِ فطرت ۴- صفائی خاطر (دارد)
۵- آب نظم پر از عذوبت (آب نمش در نہایت عذوبت) (ترخان، راشدی، ص ۲۰۲) ۶- ابر فکر پر از رطوبت ۷- ہر ہر گونہ سخن قدرتی تمامش (از عرفات العاشقین)

محمد صالح کنبوہی نے الٰہی کے شعر گوئی کے وصف میں مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیے ہیں، انہیں ''مظہر فیض نامتناہی'' جیسی عقیدت مندانہ تراکیب سے تخاطب کیا ہے، ایک شاعر کے لیے اس سے زیادہ خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے، محمد صالح نے الٰہی کے کلام کی جملہ خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے:

۱- استیناس طبیعی	۷- معنی برجستہ
۲- بسیار تازہ	۸- تازہ گوئی
۳- اشعار بلند آوازہ	۹- استعارہ بمرتبہ کمال
۴- لطف کلام (بی قیاس)	۱۰- بیشتر تازگیِ ادا
۵- شکوہ الفاظ	۱۱- نزاکت ـ و ـ
۶- بلند پروازیِ خیال	۱۲- ندرت استعارہ (از عمل صالح از محمد صالح کنبوہ)

تقی اوحدی اور محمد صالح کنبوہ نے الٰہی کی شاعرانہ خصوصیات کو مجموعی طور پر کیے بعد دیگرے احاطہ کرایا ہے جو ایک معیاری شاعر کا خاصہ قرار دی جا سکتی ہیں، اوحدی سے ملاقات کے وقت

میر الٰہی نوجوانی کی دہلیز کو پار کر رہا تھا، اوحدی نے الٰہی کی شعری ارتقا ... پیشین گوئی نہیں کیا تھا کہ ''اگر الٰہی اسی انہماک سے شعری وجدان کی مشق کرتا رہے تو یقیناً ایک اونچے درجے کا کامیاب شاعر ثابت ہوگا، اوحدی کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''... توفیق مشق یابد، شاعری بغایت خوب خواہد شد، تا غایت ... گفتہ او راک درست، رباعی وار و سخن نیز خوب می رسد''۔ (عرفات، ص ۲۳-۲۲)

میر الٰہی تقی اوحدی کی لیاقت و فراست سے مرعوب تھے، جس وقت ... دونوں بہت قریب تھے، الٰہی نے چند تازہ اشعار اوحدی کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے تھے اور اوحدی کی شان میں ایک رباعی بھی نذر کی تھی جس کے جواب میں اوحدی نے بھی یہ رباعی الٰہی کے لیے کہی تھی ؎

الٰہی کی رباعی:

بر دوش سخن گر ز غلط باری ہست
سہلست اگر مدد ز غم خواری ہست
از داوری اصلاح شفا خواہد یافت
در جتی اگر مصرع بیماری ہست

جواب اوحدی(۱):

جز فیض الٰہی از کسست یاری نیست
ادراک تو محتاج مددگاری نیست
نظم تو ز صحتست چون چشم بتان
در چشم بتان عیب زبیاری نیست

میر الٰہی نہایت نازک طبع تھے، اسی نازک مزاجی نے انہیں ہجوگوئی کی طرف مائل کر دیا تھا، الٰہی نے اپنے ہم عصروں کو تنگ مزاجی کا شکار بنایا، مولف عرفات نے اس بابت ایک جملہ لکھا:

(۱) ''وقتی در آگرہ بودیم وی ہم در آن حوالی بود، شعری چند تازہ گفتہ نزد مخلص فرستاد و بجہت مخلص خود این رباعی ہم گفتہ داخل آنہا فرستاد، بندہ ہم جواب کردہ فرستادم''۔ ماخوذ از ترخان از راشدی، ص ۲۰۷۔

''در مفاوضات ذوقی ، روستانی را بابی بسیار ، بر نحوی که سنت شعرای عصر ست

گفته است''۔ (ماخوذ از گلچین معانی ص ۵۱۹)

میر الٰہی کی بابت کہی ہوئی تقی اوحدی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ، الٰہی کے بہت جلد مشق بہم پہنچائی اور اپنی شاعری کو فن شعر کی تمام نزاکتوں سے ہم کنار کر دیا۔

تذکرۂ الٰہی (خزینہ گنج) کے مطالعہ کے بعد ایسے حوالے دست یاب ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ میر الٰہی چند متقدمین شعرا سے کس حد تک متاثر تھے۔

الٰہی خواجہ سلمان ساوجی کی شاعری اور خصوصاً رباعی گوئی کے از حد معترف تھے ، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

''مولف این تذکرہ الٰہی ، الٰہی الحسینی الہمدانی این رباعی خواجہ سلمان ساوجی را مستزادی ساختہ و حسن ادای او را سکو تر از اول پرداختہ...... کہ بر عارفان روا است''

رباعی	رباعی
خواہم شکی چنانکہ تو دانی و من	خواہم شکی چنانکہ تو دانی و من
بزمی کہ در آن بزم تو دانی و من	دور از کہ و مہ تو دانی و من
من زیر بسترت خوابانم و تو	من بزیر بسترت بخوانم و تو
آن کس کہ مست را بخوابانی و من	آن کہ ...... را بخوبانی و من
خواجہ سلمان ساوجی	میر الٰہی تذکرہ الٰہی ، الف ص ۸۰ (در حاشیہ)

میر الٰہی نے مولانا آہی کے لیے 'شائستۂ رحمت الٰہی' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں ، ایسا لگتا ہے الٰہی کو مولانا آہی سے عقیدت تھی ، الٰہی کو مولانا آہی کی ایک غزل بہت پسند آئی لہٰذا انھوں نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی ، چنانچہ رقم طراز ہیں :

''مولف کتاب الٰہی الحسینی جواب این غزل پرداختہ و در پہلوی ہم مرقوم است

غزل الٰہی

(کذا) ...... آب زدہ ...... جگر سیر ژالہ را	بر دوش سبزۂ مژہ بین رقص ژالہ را
بیداری کرشمہ دہ از چشم خواب	شب زندہ دار سینۂ من کرد نالہ را

[illegible]

(تذکرۂ الٰہی ، ب ۳۶)

[illegible] ایک شعر ہے ، چنانچہ لکھتے ہیں

''[illegible] (نام ہمدان) [illegible] تحریر نمود۔

[illegible]

مولانا آہی کو بے مثال معما گو تصور کرتے ہوئے الٰہی ان کی طرز میں ایک رباعی کہتے ہیں

''مولف این تذکرۂ الٰہی ، الٰہی الحسینی رباعی ..

صفت اشتہا گفتہ بود ، بجہت مناسبت مقام در قلم آورد''۔

رباعی :

ہر گوشہ کہ اشتہای سوہان زدہ است

در کشور معدۂ تو جمع آمدہ است

از بس کہ نخندید و بری تکبر فرو

ہر لقمہ ز دست تو دل خون شدہ است

(تذکرۂ الٰہی ص ۱۲)

فارسی ادب میں جلال الدین آذری کا تذکرہ ''مفتاح مدہ'' بڑی شہرت کا حامل ہے ، وہ ایک مستند شاعر بھی ہے ، الٰہی ان کی شاعرانہ برتری کے معترف ہیں ، یہی وجہ ہے کہ الٰہی ان کے دیوان کو ''گنج سراسر جواہرات'' کے نام سے اپنے تذکرے میں یاد کرتے ہیں ، الٰہی کو اس بات کا افسوس ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں آذری کی شاعرانہ موشگافیوں کا پوری طرح سے احاطہ کرنے سے قاصر ہیں ، البتہ انھیں آذری کا ایک مطلع پسند آیا جس پر الٰہی نے تضمین کی ہے اور اس طرح آذری کو خراج تحسین عطا کیا ہے ، الٰہی لکھتے ہیں :

"دیوان شیخ سراسر جواہرات است، در این تذکرہ کہ خزینہ گنج الٰہی ست گنجایش

تمام آن ندارد، خلاصہ از غزلیات ایشان کہ خوبی تمام دیوان در وست مرقوم می شود

مطلع شیخ را کہ فرمودہ ام

کہ بریں طارم زر اندود است   خطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است   (آذری)

تضمین الٰہی   نوشتہ اند الٰہی بگر باد و فریاد   خطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است   (الٰہی)

اس میں شک نہیں کہ شعر و شاعری کے میدان میں میر الٰہی اپنے معاصرین میں سربرآوردہ تھے۔ الٰہی نے اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر شاہ جہاں مہابت خان اور ظفر خان احسن کے قصیدوں میں دکھائے ہیں، دیگر صوبہ داروں اور امیروں کی مدح سرائی سے مزید قدر دانی کے مستحق ہوئے اور اپنا ایک اہم مقام پیدا کیا، مولف عرفات نے ان کے دو سو کے قریب اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے، راقم کے پاس الٰہی کے دیوان کا زیراکس ہے جو برلن لائبریری جرمنی کا مخزونہ ہے۔ اس دیوان میں الٰہی کے چار ہزار سے زیادہ اشعار ہیں، دوسرا دیوان برٹش میوزیم لندن اور تیسرا صولت حسین۔ ٹھ ریکی رام پور میں محفوظ ہے، راقم ان دواوین کے تقابلی متن کے بعد الٰہی کے دیوان کا صحیح نسخہ تیار کرنے میں کوشاں ہے، فی الوقت راقم کی پوری توجہ الٰہی کے تذکرے کی تحشیہ پر مرکوز ہے، ذیل میں الٰہی کا چیدہ چیدہ منتخب کلام پیش کیا جا رہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم الٰہی کے اشعار کا علمی تجزیہ کریں، ان کے دیوان کے مشمولات پر نظر ڈال لینی ضروری ہے:

۱- دیوان الٰہی: سنہ کتابت ۱۰۳۲ھ، مخزونہ برٹش میوزیم کے مشمولات

۱- قصیدہ در مدح ائمہ
۲- شاہ جہاں (قصیدہ)
۳- مہابت خان (قصیدہ)
۴- دیگر امرا (قصیدہ)
۵- تاریخی مادے
۶- ترجیع بند
۷- قطعات
۸- مرثیہ در بارہ حضرت حسین
۹- مثنویاں بوزن مخزن (نظامی گنجوی)
۱۰- غزلیات
۱۱- رباعیات
۱۲- ترقیمہ ندارد

منتخبہ اشعار کے آئینہ میں میر الٰہی کا محاسبہ   یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔

الٰہی کے اشعار میں زبان کی پختگی اور شستگی [illegible] بدرجہ اتم نمایاں ہیں، ان کے یہاں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ وسعت نظر کی اور صنائع و بدائع کا برجستہ استعمال موجود ہے، الٰہی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کے اشعار معاملہ بندی، عشق و عاشقی کے خوبصورت نمونے [illegible] ہیں، الٰہی نے قصیدہ نگاری کے میدان میں تشبیب [illegible] کے علاوہ، مہابت خان، ظفر خان احسن [illegible] قصیدے بھی کہے ہیں، ظاہر ہے ان قصیدوں کے پس پردہ [illegible]۔

جناب توحید عالم نے الٰہی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"الٰہی ایرانی مذاق سخن رکھتا تھا اور شاعری میں اس کا رتبہ بلند تھا"۔

تقی اوحدی نے الٰہی کو "مجموعہ [illegible]" اور [illegible] "مظہر فیض نامتناہی" کے القاب سے الٰہی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے، الٰہی کے اشعار [illegible] لطیف احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

الٰہی کے فرمودات سے بہت سی غزلوں [illegible] نظارہ آب ہو جاتا ہے اور شرارہ حسن کی تاب [illegible] محبوب کے حسن [illegible] جاتا ہے۔

ز آب روی تو نظارہ آب می گردد   ز خجلت تو [illegible] آفتاب می گردد

الٰہی صحرائے عشق میں چوکنا رہنے کی ترغیب دیتے ہیں، [illegible] ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ "صیاد" کی طرف سے بے خبری خطرناک ہے۔

خواہ آہو باش خواہی شیر در صحرای عشق   بے خبر منشین کہ آن صیاد غافل می رسد

الٰہی نے اس حقیقت کی طرف پہلی مرتبہ نشان دہی کی ہے کہ اگر مجاز و حقیقت یکجا آجائیں تو عشق کی آگ دو آتشہ ثابت ہو سکتی ہے۔

تا نشاۂ مجاز و حقیقت یکی شود   کاش این دو بادہ را ہمہ در یک سبو کنند

تو تیستی بمیان چہ مست بنی ست   کہ از بنائے رخت کندہ باد ایں دیوار

الٰہی اپنے کمزور و مریل گھوڑے کے بارے میں لکھتا ہے:

در آب اگر رود ز ہم باشد   خاصیت اسپ کاغذیں دارد

گفتم وا نمی کنم ترا "تقفا"   مہر تو بمن متیجہ کیں دارد

اسپی کہ باسپ کاغذیں ماند   کی طاقت داغ آتشیں دارد

قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، صوبہ دار کشمیر ظفر خان احسن کی مدح میں رقم طراز ہیں:

ہر جا کہ فضل مخزن جود تو شود   دریا اگر بدست تو افتد گدا شود

مدح تو از زبان نرود زانکہ تیغ تو   تا حشر اگر نشوی جوہر نمی رود

از ہر درے کہ ہست مرادت بکام باد   کز ہیچ گونہ دولت ازیں در نمی رود

ہر جا فتادہ عکس گل آتشیں در آب   گویا بدام موج سمندر گرفتہ است

ای گل بیا کہ بہ دست از ابر چشم من   لب غنچہ بشگفد و رخ چمن چمن

گلدستہ زر از سر ہر خار بشگفد   روز یکہ جشن شاہ جہاں بوالمظفر است

صاحب قران کہ گوہر شاداب اختران   بہر نثار محفل عیدش مقرر است

مثنوی الٰہی کے منتخبہ اشعار   جہاں گیر کی مدح میں ایک مثنوی کے چند اشعار:

در عہد شہنشہ مکرم   یعنی کہ جہاں پناہ اعظم

دیباچہ عقل و نور و بینش   سر لوح کتاب آفرینش

دارا منش ، سکندر اقبال   آرایش ہر چوں سپر سال

خورشید سپر بہ ماہ مسند   شاہنشہ نور دین محمد

چوں گوہر نام بود جہاں گیر

خاصیت مہر شان شہنشہ   آوردہ شکست در رخ ماہ

الٰہی کے دیوان میں ایک ساقی نامہ اور ایک نہایت دل کش بہاریہ قصیدہ بھی شامل ہے جس پر آیندہ بحث کی جائے گی۔

الٰہی کے مذہبی عقاید   میر الٰہی کے مذہبی عقاید بڑی الجھن میں ڈال دیتے ہیں، ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ الٰہی کس عقیدہ اور مسلک کے پابند تھے:

(الف)

نہ رافضی نہ منافق نہ خارجی ہستم   کہ ہر سہ بیہدہ دوزخ بروز غفر اند

بہ آل عبا چہ رکردہ چشم امید   نشستہ ایم کہ ... را بحشر بر بانند

بمہ ستائش یاران مصطفےٰ شدہ ایم   دگر چہ گویم الٰہی کہ مومنم خوانند

(ب) دوسری جگہ کہتے ہیں:

نو مسلمانم ہمی ایمان از جان آوردہ ام   وصف مے را چوں شہادت بر زبان آوردہ ام

(ج) نقطوی تحریک سے متعلق الٰہی کا عقیدہ دیکھیے:

یک نقطہ از خط مکتوب مظہرم   لیکن بحفظ عالم مغیست مظہرم

(د) الٰہی کے دوملتی ہونے کی توجیہ ملاحظہ کیجیے:

از نور لم یزل قلم صنع در ازل   بر لوح دل نگاشتہ اللہ اکبرم

محمودم از سعادت نور محمدی   در ملت صحابہ و آل پیمبرم

بر چہرہ دارم از رہ شان دوملتی   کز بہترین حصار بود روز محشرم

تا بر سرم سایہ سادات افراست   بر تارک علاقہ کیوان رسد سرم

دین حنیف را حنفی و از بانعم   درخت چار یار چو سد سکندرم

اول تصوریست کز ادراک عقل زاد   تصدیق بر خلافت صدیق اکرم

تریاق من محبت فاروق اعظم است   از ہر عدو کہ زہر شا

آخری شعر بڑا چونکا دینے والا ہے۔

سنی دلم و زبانم شیعی با علی   خلق گوید کہ من بعالم معنی دو پیکرم

الٰہی نقطوی (۱) تحریک کے مبلغ تھے، اس تحریک سے وابستہ افراد وسی خانی بھی کہلاتے تھے، شاہ عباس اول کے دور میں نقطویوں کو ایران میں سزائے موت دی جارہی تھی لہٰذا ہندوستان

---

(۱) دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

عہد اکبری میں وسیع المشربی کے باعث ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا، نقطوی اہل ہنود کے مذہبی عقاید سے قریب تھے، ہندوی فلسفہ میں ایک گول انڈے کو وجود کائنات کا محرک قرار دیا گیا ہے، نقطوی فلسفہ انڈ، پنڈ، برہمانڈ کے علاوہ آواگون یعنی زندگی بعد از موت کے بھی کسی حد تک قایل تھے، الٰہی سے قبل مُلا صوفی مازندرانی بھی جان بچا کر ہندوستان چلے آئے تھے(۱)۔

نقطوی خیالات کی ترجمانی کے لیے الٰہی نے ایک مختصر مثنوی (۱۳۹ اشعار پر مبنی) خدائے سخن نظامی گنجوی کی بحر میں کہی ہے، اس مثنوی کے نصف اشعار آب زدہ ہوگئے ہیں بقیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

الٰہی نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے حروف تہجی کی وضاحت ذیل کی مثنوی میں کی ہے، ملاحظہ کیجیے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   قافلہ سالارِ قرآن حکیم
سرو سرافراز ریاض ابد   وحی ازل از گل روی سبد
فاتحہ گوئی ز شرف کربلا است   بسملہ بحر فراتش گوا است
لوح مبین معنی بسم اللہ است   معنی قرآن بسم اللہ است
ہست چو در نقطہ اشارات ذات   چوں نبود مظہر آیات ذات
با کہ بود بر ہمہ بالا نشیں   تاج کرامت شدہ فرق مبین
بسم اللہ در فاتحۂ ہر کلام   شبیہ رسول است علیہ السلام
مہ نبوت نقطہ پائی او   جوہر خط مسجد اقصائی او
آمدہ دندانہ سین در حساب   شانہ کش طرۂ ام الکتاب
جست معنی کشش مدسین   تاب دہ رشتۂ حبل المتین
حلقۂ میمش کہ بود دل کشا   شاہد شب را بود خلخال پا

(۱) ایران میں جب بسیخیوں اور نقطویوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو بہت سے شعرا اور علما وہاں سے بھاگ کر ہندوستان آئے جہاں اکبر جیسا وسیع القلب بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔ مقالہ احمد آباد میں ایرانی شعرا کی آمد، از سید امیر حسن عابدی، جرنل نمبر ۳، پیر محمد شاہ لائبریری فرست، مرتب پروفیسر بمبئی والا ۲۰۰۲ء۔

([illegible])

[illegible]

(دیوان [illegible])

[illegible]

دیوان الٰہی میں معروف حوالے   (۱) مہابت خان: الٰہی نے مہابت خان کے نام قصیدے [illegible] قصیدہ نمبر ۲۱ [illegible]

(۲) ظفر خان احسن: احسان اللہ احسن بن خواجہ ابوالحسن، منصب دار و صوبہ دار کشمیر ۱۰۳۳ھ میں ظفر خان کے خطاب سے نوازا گیا۔

(۳) [illegible] ۱۰۲۸ھ میں آگرے کی حفاظت پر مامور ہوا، [illegible]

(۴) [illegible] قصیدہ نمبر ۳۱ [illegible] تزک ص ۳۱۵۔

(۵) حکیم غزنوی [illegible]

(۶) شعر: بشرح مثنوی داند کہ روح مولوی نازد   حکیم غزنوی داند کہ ایں شرح از حد میسر شد
۱۔ شرح مثنوی مولوی معنوی (مولانا روم)۔ ۲۔ روح مولوی (مولانا رومی)۔ ۳۔ حکیم غزنوی؟

(۷) نظام الملک [illegible] الدولہ افضل خان [illegible] جہان گیر کا میر سامان بنا۔ (تزک ص ۳۹۹، ۱۰۲۹ھ میں دکن کی فتح کے بعد دیوان مقرر ہوا، ص ۳۵۹)۔

(۸) [illegible] (قصیدہ نمبر ۳۳)۔

(۹) شعر، ق ۲۴،   سعد اکبر سعید خان کہ کفش   رزق تنہا دو را ضمان باشد
سعید خان ولد احمد بیگ، جہاں گیر کا ایک معتبر امیر اور سردار، تزک ص ۳۸۵۔

میں بھی یہ بزرگ شاہی فوج میں ملازم رہے، ان کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا اور زاہد ان کا تخلص تھا، انہوں نے بسم اللہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کو سن کر بادشاہ وقت [illegible] نے ان زاہد کو جھجھاڑ خاں کا خطاب اور زر کثیر عطا کیا تھا، شیخ شمس الدین زاہد نے ملا سرائے میں ۹۵۰ھ مطابق ۱۵۴۳ء میں ایک سہ دری عمارت تعمیر کرائی جو گنبد جھجھاڑ خاں کے نام سے موسوم ہوئی اور آج بھی اسی نام سے موجود ہے اور اپنی خستہ حالت پر آنسو بہا رہی ہے، ۹ ذی الحجہ ۱۵۸۲ء کو جھجھاڑ خاں کا بدایوں میں انتقال ہوا اور اپنے تعمیر کردہ گنبد کے باہر دفن ہوئے، مشہور زمانہ مورخ ملا عبدالقادر بساوری ثم بدایونی نے اپنی یادگار زمانہ تالیف منتخب التواریخ میں جھجھاڑ خاں کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے، شیخ شمس الدین زاہد لاولد فوت ہوئے البتہ ان کے بھائی شیخ محمد کے صاحب زادے ملا محمد یوسف تھے جن کو شہزادہ نور الدین محمد سلیم کا استاد ہونے کا اعزاز حاصل تھا، شہزادہ سلیم جب جہاں گیر کے نام سے تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے استاد کو معزز عہدے پر فائز کیا اور ان کو بدایوں میں واقع شاہی اوقاف کا متولی بھی بنایا، ان کی یہ تولیت ان کی نسل میں نسلاً بعد نسل چلتی رہی، اسی لیے شیخ صدیقی عبدالرحمٰنی کی یہ نسل متولی نام سے بھی مشہور ہوئی، ملا محمد یوسف متولی کی آٹھویں پشت میں ایک بزرگ حکیم نیاز احمد گزرے ہیں جو عربی و فارسی کے عالم و فاضل اور خوش نویس تھے۔ حکمت میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا، حکیم شیخ نیاز احمد کو اللہ تعالیٰ نے اولاد نرینہ میں دو فرزند شیخ رضا احمد اور شیخ اعجاز احمد عطا کیے تھے، آخر الذکر شیخ اعجاز احمد کے تین فرزند تھے، شیخ طفیل الدین احمد طفیل بدایونی متوفی ۱۹۴۳ء، شیخ حسنین احمد مورخ بدایونی متوفی ۱۹۵۵ء، اور شیخ اکرام احمد شاد بدایونی متوفی ۱۹۶۴ء، شیخ طفیل الدین احمد لاولد فوت ہوئے، ہند و پاک کے مشہور شاعر شفیق احمد منور بدایونی متوفی ۱۹۸۴ء اور فاروق احمد محشر بدایونی متوفی ۱۹۹۴ء، شیخ حسنین احمد مورخ کے فرزند تھے جب کہ جدید لب و لہجے کے معروف شاعر عرفان صدیقی متوفی ۲۰۰۴ء، شیخ اکرام احمد شاد کے حقیقی پوتے تھے۔ شیخ اعجاز احمد کے تین بیٹیاں بھی تھیں جن میں سے بڑی بیٹی قدسیہ النساء عرف بٹھو مولوی مجتہد الدین عیش بدایونی متوفی ۱۹۵۵ء کے حبالۂ عقد میں آئیں، عیش بدایونی مولانا امیر مینائی کے شاگرد رشید تھے، دوسری صاحب زادی قدسیہ فاطمہ مولوی احمد الدین متولی کو منسوب تھیں جو عیش بدایونی کے حقیقی بھتیجے تھے، جب کہ تیسری صاحب زادی تنویر فاطمہ مولوی

[illegible] حسنین [illegible] کی بیگم تھیں، [illegible] متوفی ۱۹۹۱ء، تنویر فاطمہ سے [illegible] صاحب [illegible] تھے۔

سبطین احمد کے بڑے فرزند شیخ رضا احمد متولی (وفات ۱۹۱۰ء) تھے، یہ بھی اردو ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور شاطر ان کا تخلص تھا، پیشے کے اعتبار سے یہ وکیل تھے، مولوی رضا احمد شاطر کا پہلا عقد منصف کمال الدین متولی کی صاحب زادی سے ہوا تھا جن سے ایک بیٹی قدسیہ النساء عرف گلّو یادگار تھیں جو اپنے چچازاد بھائی مولوی طفیل الدین احمد کو منسوب ہوئیں، مولوی رضا احمد کا دوسرا عقد بدایوں کے ایک دوسرے شیخ صدیقی خاندان کے فرد مولوی قاضی نذر اللہ صدیقی حمیدی کی صاحب زادی لطف الفاطمہ سعیدہ سے ہوا تھا جو بوجان کے نام سے یاد کی جاتی تھیں، بوجان کے بطن سے شیخ مولوی رضا احمد متولی کے گھر محلہ سوتھہ میں یکم اپریل ۱۸۹۸ء کو ایک بیٹے نے جنم لیا جو آگے چل کر مولوی سبطین احمد کے نام سے جانا اور پہچانا گیا، آج ان ہی مولوی سبطین احمد کا تذکرہ کرنا مقصود ہے، بوجان کے بطن سے دو بیٹیاں مسماۃ زینت فاطمہ اور مسماۃ آمنہ خاتون بھی تھیں، اول الذکر کی شادی مولوی رضی الاسلام ہاشمی وصل بدایونی متوفی ۱۹۴۵ء سے ہوئی تھی جو معروف شاعر عرفان صدیقی اور نیاز صدیقی صاحب کی حقیقی نانی تھیں جب کہ آخر الذکر کا عقد مولوی رئیس الاسلام ہاشمی محمد حامد متوفی ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔

اپنے خاندانی شجرۂ نسب باقیات الصالحات مطبوعہ ۱۸۹۷ء میں مولوی طفیل الدین احمد نے اپنے تایا کی اولاد میں صرف ایک نام غلام برکات درج کیا ہے جب کہ اسی خاندان کے دوسرے شجرۂ نسب شجرۃ الصدیق مطبوعہ ۱۹۲۳ء میں غلام برکات کا نام نہ ہو کر مولوی سبطین احمد کا نام درج ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی رضا احمد کے ایک بیٹے غلام برکات بھی تھے جن کا وصال اوائل عمر میں ہو گیا ہوگا، اسی وجہ سے شجرۃ الصدیق میں ان کا نام نہیں آسکا، یہ علم نہ ہو سکا کہ غلام برکات مولوی رضا احمد کی کون سی بیگم کے بطن سے تھے، اسی خاندان کا ایک اور شجرہ کلمۃ باقیہ بھی ہے جس کے مرتب شیخ نصیر الدین تھے، یہ شجرہ ۱۹۲۷ء میں مولوی مجتہد الدین عیش بدایونی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا تھا، اس میں بھی غلام برکات کا نام نہ ہو کر مولوی سبطین احمد کا نام درج ہے، واضح رہے مذکورہ تینوں شجروں میں صرف اولاد ذکور کے نام درج ہیں۔

مولوی سبطین احمد چونکہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے اس لیے اہل خاندان نے ان [illegible] پکارا، مولوی سبطین احمد کا بچپن خوب لاڈ پیار میں گزرا کیوں کہ یہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ذکور تھے، سونے پر سہاگہ ان کی ننہال میں بھی ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا یہاں تک کہ ان کی والدہ کے حقیقی بھائی قاضی [illegible] بھی جن کے یہاں مولوی سبطین احمد کی پیدائش سے ایک سال قبل ۱۸۹۷ء میں لاولد انتقال کر چکے تھے، مولوی سبطین احمد ابھی بارہ سال کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، اس لیے ان کی ساری کفالت ان کی والدہ نے کی، سبطین احمد نے ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق عربی، فارسی اور اردو میں حاصل کی، انگریزی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا زاد بھائی مولوی اکرام احمد شاہ صدیقی سے پڑھیں اور انہوں نے ہی ان کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا، مزید تعلیم کے لیے ان کو بدایوں کے اس وقت کے واحد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا، چونکہ ان کی والدہ اپنے صاحب زادے کی تعلیم سے مطمئن تھیں اور ان کی علمی لیاقت و ذہانت سے بھی واقف تھیں اس لیے ان کو ہائی اسکول سے آگے کی تعلیم دلانے کی غرض سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل کرا دیا گیا جہاں ان کی رہائش میکڈانلڈ ہاسٹل میں رہی، علی گڑھ سے سبطین احمد نے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بدایوں واپس آگئے۔

جس زمانے میں مولوی سبطین احمد بی۔ اے کی ڈگری لے کر وطن واپس آئے، اس عہد میں بدایوں اور شیخوپور کے رؤسائے انجمن تعلیم مسلمانان بدایوں کے تحت بدایوں شہر میں مشن اسلامیہ ہائی اسکول شیخوپور، بدایوں (قیام ۱۹۱۷ء) نام سے ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس کے لیے اساتذہ کی ضرورت تھی، حسن اتفاق مولوی سبطین احمد شریف النفس اور نجیب الطرفین خاندان کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے، اس لیے اسکول کے ارباب حل وعقد نے ان کو اسکول کے اسٹاف میں شامل کرنے کی حامی بھر لی اور انہوں نے ۱۱؍ جولائی ۱۹۱۹ء سے نایب مدرس کی حیثیت سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور تقریباً اکتالیس سال اپنی خدمات انجام دے کر اپنی ملازمت کی مدت پوری کرتے ہوئے یکم اپریل ۱۹۵۹ء کو حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج شیخوپور، بدایوں سے وظیفہ یاب ہوئے، (واضح رہے مشن اسلامیہ ہائی اسکول ۱۹۴۴ء میں آنور تحصیل

بدایوں کی مخیر شخصیت حافظ محمد صدیق متوفی ۱۹۵۰ء کی مالی مدد سے انٹر کالج میں تبدیل ہو گیا تھا، اسی لیے اس کا نام حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج شیخوپور، بدایوں پڑا)، [illegible] نے ۱۹۲۵ء میں اسکول سے چھٹی لے کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے استاد ہونے کی سند بی۔ ٹی حاصل کی، کالج کی ملازمت کے دوران کالج کے وائس پرنسپل بھی رہے، جب ۱۹۴۳ء میں مولوی منصور علی پرنسپل اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے تو مولوی سبطین احمد قائم مقام پرنسپل بنائے گئے، اس عہدے کو جون ۱۹۴۴ء تک زینت بخشی، جب کالج کے پہلے پرنسپل سید [illegible] علی اکبر آبادی نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا تو مولوی سبطین احمد پھر وائس پرنسپل کے فرائض انجام دینے لگے، اس کا اظہار مولوی محمد اقتدار الدین [illegible] ایم۔ ایل۔ اے صدر، مینیجنگ کمیٹی حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۸ اگست ۱۹۴۴ء کو اسکول سے کالج بننے کے موقع پر کی تھی، اپنی اس تقریر میں ایم، آئی حسن مرحوم نے مولوی سبطین احمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

" The entire staff and particularly the Vice Principal Mr Sibtain Ahmad who was offeciating before the new principal arrived and till the end of June 1944 as he head of our enistitution worked ceaselessly for months as a band of among [illegible]

اردو کے صاحب طرز ادیب و تنقید نگار جناب ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب نے اپنی تصنیف بدایوں کے اساتذۂ سخن مطبوعہ ۱۹۹۹ء میں تحریر کیا ہے کہ سبطین صاحب اسلامیہ انٹر کالج بدایوں میں ۲۵ سال تک استاد رہے، موصوف کی یہ بات غلط ہے، میں نے کالج ریکارڈ سے مولوی سبطین احمد کی تاریخ جوائننگ اور تاریخ ریٹائرمنٹ درج کی ہے جو بالکل صحیح ہے، کالج کی ملازمت کے دوران انہوں نے ہزاروں شاگردوں کو علمی اور اخلاقی درس دیا، ان کے ہزارہا شاگردوں میں ہندو پاک کے ممتاز ادیب پروفیسر ابو اللیث صدیقی متوفی ۱۹۹۴ء، شکیل بدایونی متوفی ۱۹۷۰ء، دلاور فگار متوفی ۱۹۹۸ء، پروفیسر ایوب قادری متوفی ۱۹۸۳ء، عرفان صدیقی متوفی ۲۰۰۴ء،

خوب [illegible] محسوس کرتا تھا، وہ تو اللہ کا کرم ہے کہ قلم گھسنے کی سکت باقی ہے ورنہ دن
[illegible]
[illegible]
[illegible]
تھوں، فرخندہ وشے بادہ وخوش مہتاب ہے، سو وہ اب کہاں نصیب ہوسکتی ہے"۔

۱۹۶۵ء میں نقل وطن کرنے کے بعد مولوی سبطین احمد کو بدایوں اور علی گڑھ کی یادیں برابر ستاتی رہیں، مگر وہ مجبور تھے کر بھی کیا سکتے تھے، آخر کار وہ دن بھی آگیا جب بدایوں کی اس نابغۂ روزگار شخصیت کے نام اپنے محبوب حقیقی سے ملنے کا پروانہ آگیا اور ۲۴؍اگست ۱۹۷۱ء مطابق ۲؍رجب ۱۳۹۱ھ بہ [illegible] نے اجل کو اپنے گلے لگالیا اور کراچی پاکستان کی خاک کا پیوند بنے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوگئے، بہ قول غالب:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں		خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مولوی سبطین احمد کی وفات پر بہت سے شعرا نے قطعات تاریخ وفات کہے تھے، ان میں سے ایک قطعہ یہاں پیش کرتا ہوں جو مولوی ابرار حسن صدیقی ابرار بدایونی کی فکر کا نتیجہ ہے، لکھتے ہیں:

قبلہ سبطین احمد ذی جاد		ماہِ فکر تلامذہ کہ نہفت
پئے تاریخ رحلتش ہاتف		آرزوئے اساتذہ می گفت

۱۳۹۱ھ

مولوی سبطین احمد کو ادبی ذوق وراثت میں ملا تھا، انہوں نے جس خاندان میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اس خاندان میں شعر وادب کا طوطی بول رہا تھا، حق تو یہ ہے کہ اس عہد کے [illegible] کا مزاج ہی شاعرانہ اور ادیبانہ تھا، ہر تعلیم یافتہ شخص شاعری کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا باعث فخر سمجھتا تھا، مولوی سبطین احمد خود لکھتے ہیں:

"میں جب مدرسے کی اونچی جماعتوں میں پہنچا تو وطن اور خاندانی بیماری
اس حد تک مجھ کو لگ گئی کہ جب [illegible] مشاعروں میں (جن سے اب جان چھڑاتا ہوں)

ضرور جاتا، کبھی اس بلند آہنگ اور شرارت آمیز واہ واہ میں بھی شریک ہوتا جس کی اب
اتنی [illegible] ہے [illegible] ہوتی ہے، اب تو سامعین پہلے یہ
[illegible] ترنم کے علاوہ تحمل بھی ہے یا نہیں"۔ (غم فروزاں)

بدایوں میں کچھ خاندان ایسے بھی ہیں جن میں ایک ہی وقت میں تین تین نسلوں نے شعر وادب کی آب یاری کی ہے، ان خانوادوں میں شاہ خبیر احمد ظہیر متوفی ۱۹۰۳ء، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی متوفی ۲۰۰۳ء، مولوی سبطین احمد متوفی ۱۹۷۱ء اور جناب طارق سبزواری صاحب کے خاندان قابل ذکر ہیں، اس اعزاز پر ان کے اہل خاندان کو بجا طور پر فخر ہے گویا ع

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

مولوی سبطین احمد کے حقیقی ماموں مولوی عبدالحئی بچین متوفی ۱۸۹۷ء داغ دہلوی کے شاگرد رہ چکے تھے، ان کے چچازاد بھائی اور بہنوئی مولوی طفیل الدین احمد صاحب تصانیف تھے، انہوں نے برکات مارہرہ نام سے بزرگان مارہرہ کے حالات لکھے تھے جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی، یہ مولوی طفیل الدین احمد کی قابل قدر تالیف ہے، ان کے دوسرے چچازاد بھائی مولوی اکرام احمد شاد، مولوی احسن مارہروی متوفی ۱۹۴۰ء کے تلامذہ میں کل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے، تیسرے چچازاد بھائی مولوی حسنین احمد مورخ تلامیذ الرحمٰن کا درجہ رکھتے تھے، مولوی سبطین احمد کے والد مولوی رضا احمد باعتبار پیشہ وکیل تھے اور بلند شہر سہسوان میں وکالت کرتے تھے، اس کے باوجود ادبی شوق اور ذوق کے مالک تھے اور سید حسین کیف دہلوی کے تلامذہ میں اپنا الگ مقام رکھتے تھے، بھلا ایسے ادبی ماحول میں پرورش پانے والا بچہ خود کو کب تک اور کیسے الگ رکھ سکتا تھا، جس بچے کی ہر سانس میں شعریت لئے جا رہی ہو، جو ہر بات پر اشعار سنتا ہو وہ بچہ شاعر وادیب نہ بنتا تو اور کیا بنتا اور ہوا بھی ایسا ہی، مولوی سبطین احمد میدان ادب میں داخل ہوگئے، سونے پر سہاگہ علی گڑھ کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو خوب جلا بخشی، علی گڑھ قیام کے دوران ہی ان کے افسانے اور ادبی وتاریخی مضامین علی گڑھ میگزین، ماہ نامہ معارف اعظم گڈھ، ماہ نامہ نیرنگ خیال لاہور اور ماہ نامہ عالم گیر لاہور میں شائع ہونے لگے تھے، جب علی گڑھ سے بدایوں آگئے تو ایک پختہ قلم کار ہو چکے تھے، اسی لیے مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی کے ہفت روزہ ذوالقرنین، مولوی

انہیں اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر عبور حاصل تھا، ان کی ۷۳ سالہ زندگی میں جو ادبی کارنامے منظر عام پر آئے وہ درج ذیل ہیں:

۱- انگلستان کی کہانی معاصرین کی زبانی، مطبوعہ ۱۹۲۹ء، نظامی پریس بدایوں۔

۲- ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، مطبوعہ ۱۹۳۵ء، نظامی پریس بدایوں۔

۳- خلافت اور سلطنت، مطبوعہ ۱۹۳۹ء، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

۴- ترجمہ انگریزی سیرۃ النبیؐ حصہ دوم (مولانا شبلی نعمانی)، مطبوعہ ۱۹۷۱ء، جمعیت الفلاح کراچی پاکستان۔

۵- بدایوں کا جغرافیہ۔ ا ب ت۔

۶- اردو قواعد۔ ا ب ت۔

۷- خس و خاشاک شعری مجموعہ، مطبوعہ ۱۹۵۹ء، نظامی پریس بدایوں۔

مولوی سبطین احمد کی مطبوعہ مذکورہ کتب میں سے سیرۃ النبی حصہ دوم ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جس کا تذکرہ کرنا یہاں مقصود ہے، یہ مولوی سبطین احمد کا وہ کارنامہ ہے جو انہوں نے بزبانِ انگریزی انجام دیا اور خود کو امر کر لیا، یہ ترجمہ ہی میرے اس مضمون کا محرک ہے، دراصل چند سال قبل ماہنامہ معارف کے کسی شمارے میں علامہ شبلی نعمانی متوفی ۱۹۱۴ء کی مشہور زمانہ تالیف سیرۃ النبی کے مختلف زبانوں میں ہوئے ترجموں پر ایک محققانہ مضمون شائع ہوا تھا، فاضل مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں مولوی سبطین احمد کے ترجمے کا ذکر نہیں کیا تھا، اس مضمون کو پڑھ کر میں نے معارف کے اڈیٹر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں میں نے اپنے موقف کا اظہار کیا تھا، موصوف نے میرے خط کے جواب میں مجھے دعوت دی تھی کہ میں اس ترجمہ کے بارے میں کچھ لکھوں لیکن اس وقت تک مولوی سبطین احمد کا کیا ہوا ترجمہ میری دسترس میں نہیں تھا اس لیے مجبوراً میں خاموش ہو گیا، حسن اتفاق اسی سال یا اس سے اگلی سال مولوی سبطین احمد کے صاحب زادے جناب اویس احمد صاحب اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان سے بدایوں آئے تو میں نے ان سے سیرۃ النبی کے ترجمہ کا ذکر کیا، موصوف نے کہا کہ اس کے چند نسخے ان کے پاس کراچی میں محفوظ ہیں، بات آئی گئی ہو گئی فروری ۲۰۰۴ء میں موصوف ایک

[illegible] اپنے [illegible] نے تجدید ملاقات [illegible] ایک نسخہ [illegible] دارالمصنفین اعظم گڑھ [illegible] مجھے [illegible] مدیر ماہنامہ معارف کی [illegible]

[illegible] صفحات پر مشتمل [illegible] ۱۹۷۱ء میں [illegible] کراچی پاکستان سے شائع ہوا ہے، اس ترجمے کا متن ۹۔۳ صفحات پر مشتمل ہے جب کہ باقی صفحات انڈکس، ضروری مندرجات اور دیگر معلومات کے لیے وقف ہیں، [illegible] مولوی سبطین احمد کا تحریر کردہ ایک مضمون ہے جس کے آخر میں ۲۰ رجنوری ۱۹۷۱ء درج ہے، اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ویسے کتاب میں کسی جگہ بھی سن اشاعت درج نہیں ہے۔

سیرۃ النبی کا پہلا حصہ اردو زبان میں ۱۹۱۸ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا، اس ترجمہ کی بنیاد یہی پہلا اڈیشن ہے [illegible] مولوی سبطین احمد نے دونوں حصوں کا ترجمہ کیا تھا مگر شائع صرف دوسرا حصہ ہوا، پہلا حصہ شائع ہوا بھی تو کس کے نام سے یہ علم میں نہ آسکا، ہو سکتا ہے [illegible] حبیب بخش کے نام سے جو ترجمہ شائع ہوا [illegible] سبطین احمد [illegible] حبیب بخش [illegible]۔

مولوی سبطین احمد نے سیرۃ النبی [illegible] وقت ہوا تھا جب ۱۹۲۲ء میں [illegible] عظیم کام کرنا شروع کیا اور اس میں وہ کامیاب ہوئے، ۳۰ فروری ۱۹۲۵ء کو وہ مولوی ضیاء احمد بدایوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بدایوں تو آپ آتے ہی نہیں خیر [illegible]
انشاء اللہ ترک وطن کرتے [illegible] اب شاید [illegible]

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

ماہنامہ افکار، صہبا لکھنوی نمبر: مدیر ڈاکٹر حنیف فوق، صفحات ۵۵۶، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت ۲۵۰ روپے، زر سالانہ ۲۵۰ روپے، پتہ: سی ۵۰/۱ ڈیفنس آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی، ۷۴۴۰۰، ہندوستان کا پتا: ڈاکٹر حنیف شاہ خاں، ان آر او اے/سی ۲۲۷۱، سنڈیکیٹ بینک INT، برنس BR، اے-۴۰ کناٹ پلیس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

جناب سید شرافت علی صہبا لکھنوی اور ان کے رسالہ افکار کی حیثیت قریب نصف صدی سے لازم و ملزوم کی سی رہی، رسائل کی دنیا میں افکار کو ہمیشہ اعتبار حاصل رہا، اسی طرح ایک مخلص و وضع دار ادیب و شاعر، محقق اور مدیر کی حیثیت سے صہبا مرحوم کو بھی افتخار نصیب ہوا، ریاست بھوپال میں ان کی نشو و نما ہوئی، سرزمین لکھنؤ سے اجداد کا تعلق تھا، انہوں نے اسی نسبت کو ترجیح دی، تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی کے ہو گئے لیکن اردو کی محبت اور اس کی آفاقیت نے ان کی شہرت کو کبھی محدود نہیں رکھا، ۲۰۰۲ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کی کمی کا احساس پوری اردو دنیا کو ہوا، اندیشہ ہوا کہ ان کی مفارقت کا صدمہ رسالہ افکار کے لیے قابل برداشت نہ ہو، لیکن ان کی صاحب زادی محترمہ مقصودہ صہبا کی ہمت اور ڈاکٹر حنیف فوق کی لائق ادارت نے افکار کی شکل میں نشۂ صہبا کی سرمستی و سرشاری میں فرق نہیں آنے دیا، ان کے سلیقہ و حوصلہ کی مثال یہ ضخیم نمبر بھی ہے جس میں جناب صہبا مرحوم کی شخصیت ادیبانہ و شاعرانہ خدمات خصوصاً افکار کے زمانۂ ادارت کے متعلق مختلف ابواب کے تحت عمدہ اور مفید تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں، حصہ نظم بھی کم نہیں، آخر میں خود صہبا مرحوم کی نظموں اور مضامین کا ایک انتخاب بھی ہے، فاضل مدیر کے قلم سے اداریہ بہ عنوان اشاریہ کے علاوہ ایک مفصل مضمون بھی ہے اور یہ گویا اس نمبر کا حاصل ہے، یہ کہنا درست ہے کہ صہبا اور افکار نے زندگی بھر انسانی زندگی کی ترقی پسندانہ فکری و ادبی سرگرمیوں کی آب یاری کی، وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہی نہیں اس کے منادی بھی تھے لیکن ان کی طبعی شرافت و شرقیت نے

ان کے قلم کی رفتار کو وہ جولانی نہیں دی جس کے اثر سے ان کے کئی ہم عصر ترقی پسند اہل قلم بے مہار گردانے گئے، اس راہ میں وہ ہر اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیازانہ گزرے، وجہ یہی تھی کہ ان کے پیش نظر مادی و مالی آسائش سے زیادہ حریت افکار کی اہمیت تھی، ان کی شخصیت کے گرد ادب کا ہالہ بڑا نمایاں رہا لیکن وہ خود تفوق کے پندار سے آزاد رہے، ان کی تصنیفات کی فہرست مختصر ہے اور اس کی وجہ شاید افکار کی ادارت کی غیر معمولی محنت بھی ہو لیکن اقبال اور بھوپال جیسی کتاب ان کی تصنیفی صلاحیت کے اعتراف کے لیے کافی ہے، اس کے علاوہ انہوں نے افکار کے قریب پینتالیس خاص شمارے بھی شائع کیے، ان میں اقبال، حفیظ، جوش، فیض، ندیم احمد قاسمی کے متعلق ایسے خصوصی شمارے ہیں جن کی حیثیت دستاویز سے کم نہیں، برطانیہ میں اردو کے متعلق ان کا خاص نمبر بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھا گیا، ان کی زندگی کی روداد واقعی رشک کے لائق ہے اور اس خاص شمارے میں اس زندگی کے قریب ہر گوشے کو روشن کیا گیا ہے، یہ احساس غلط نہیں کہ افکار کی صورت میں، رہ جائے گا زندہ نام صہبا لکھنوی۔

جریدہ، متروکات-لغت، متروکات کی تاریخ دستاویزات کی روشنی میں: مرتبہ جناب سید خالد جامعی، جناب عمر حمید ہاشمی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۳۶، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف کے ترجمان جریدہ کے بعض اہم شماروں مثلاً فلسفہ لسان پر اہم تحقیقی مطالعات اور قدیم لسانیات و ادبیات نمبر کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، مباحث کی انفرادیت، مضامین کی جدت اور غیر معمولی تحقیق و محنت کی وجہ سے ان شماروں کی افادیت ایک حقیقت ہے جس کی وجہ سے اب جریدہ کی اشاعتوں کا انتظار رہتا ہے، زیر نظر شمارہ بھی گزشتہ نمبروں کی طرح داد کے لائق ہے، افسوس ہے کہ اس کا حصہ اول ہم کو نہیں ملا جس میں متروک الفاظ اور ان سے متعلق عالمی سطح پر ہونے والی کاوشوں کا ذکر ہے، زبانوں کے عروج و زوال کی تاریخ، فوجوں اور ملکوں کی تاریخ سے کم دل چسپ نہیں اور ان کے اسباب کا مطالعہ و ادراک تنقید و تحقیق کے دامن کو اور زیادہ ثروت مندی کرتا ہے، زیر نظر شمارے میں چھٹی صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک اردو کے ذخیرہ الفاظ اور لہجہ و اسلوب و بیان میں مسلسل تبدیلیوں کا

جائزہ لیا گیا ہے اور ج سے ق تک متروکات کی فہرست بھی ہے، دل چسپ ہونے کے ساتھ یہ بحث بھی قابل ہے، مثلاً جانگھ، جاداو، جار، جاف، جاگر جیسے الفاظ کے متروک ہونے میں شبہ نہیں لیکن جامہ بہ معنی لباس و پوشش یا جناد ھاری اور جمان جیسے الفاظ کی اس فہرست میں شمولیت محل بحث ہے، چیلنج کا لفظ بھی ہے جس کی تشریح میں کہا گیا کہ اردو میں اس مفہوم کا کوئی لفظ نہیں، چنوتی ہندی لفظ ہے مگر کم مستعمل ہے، یہ بھی لکھا گیا کہ پہلے اس مفہوم میں تہدی کرنا عام طور پر رائج تھا، یہاں تہدی کا اصل املا تحدی ہونا چاہیے تھا، لغت متروکات سے پہلے اردو میں متروکات کی ایک بحث دستاویزات کی روشنی میں ہے جس میں اردو کا دنیا کی کئی اہم زبانوں سے تقابل کیا گیا ہے، لسانیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں پر لطف معلومات ہیں مثلاً اردو میں متروکات کا عمل دیگر زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن یہ دعویٰ بہرحال محل نظر ہے کہ ۱۵۰۰ سو سالہ اور ایک ہزار سالہ اردو کے مخطوطات کے نمونے آج بھی ایک عام آدمی پڑھ سکتا ہے، اس جلے میں بھی ادعائیت ہے کہ اردو زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس میں تمام زبانوں کے الفاظ و اسالیب کی خصوصیات سمائی ہیں، اردو، ہندی اور انگریزی رسم خط کی بحث میں کہا گیا کہ اردو حروف کی بنیادی شکلیں پندرہ ہیں اور گیارہ حروف ایسے ہیں جو شکل نہیں بدلتے، اس کے مقابلے میں انگریزی کے چھبیس حروف کو تین طرح سے یعنی ۷۸ شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا ضروری ہے، اس عمدہ شمارے کے لیے جامعہ کراچی کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور جریدہ کے مرتبین لائق مبارک باد ہیں۔

ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نمبر (اشاعت خاص-۲): مدیر پروفیسر خورشید احمد، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۵۶۰، قیمت ۸۰ روپے، زر سالانہ ۳۰۰ روپے، پتہ: ۵-اے، ذیل دار پارک، اچھرہ، لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے حالات و افکار پر ماہ نامہ ترجمان القرآن کے خاص نمبر کے پہلے حصہ کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، زیر نظر شمارہ اس کا دوسرا اور آخری حصہ ہے، پہلے حصے کی طرح اس میں بھی مولانا کی زندگی، فکر، جدوجہد اور نتائج و ثمرات پر ان کے رفقا و معتقدین کے عمدہ مضامین آگئے ہیں، مضامین کے انتخاب و ترتیب میں یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ مولانا کو ایک طبقے تک محدود رکھنے کی بجائے، امت کے بڑے حصے کے لیے قابل قدر اور غیر مسلموں کے لیے

ایک معلم و مبلغ کی حیثیت سے پیش کیا جائے، شروع میں بڑی دردمندی سے گزارش کی گئی ہے کہ اگر کھلے دل سے مولانا مودودی کے قلمی آثار کا مطالعہ کیا جائے تو انصاف کی نظر مختلف نتائج کا مشاہدہ کر سکتی ہے، میاں طفیل احمد، مولانا محمد چراغ، نواب زادہ نصر اللہ خاں اور سیدہ حمیرا مودودی جیسے قریبی اعزہ و رفقا کی تحریروں سے مولانا مودودی کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے متاثر کن گوشے سامنے آتے ہیں تو پروفیسر خورشید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر عبدالمغنی اور ڈاکٹر محمود احمد غازی وغیرہ کے مضامین سے فکر مودودی بھی اور واضح اور روشن نظر آتی ہے، مولانا ے مرحوم کے اثرات اور ان کی عصری معنویت پر ڈاکٹر خالد علوی، مولانا جلال الدین عمری کے مضامین بھی تجزیہ و احتساب کی عمدہ مثال ہیں، ایک دل چسپ مضمون مستشرقین اور مولانا مودودی کے عنوان سے ہے، اس کے علاوہ افریقہ میں مولانا کے طرز فکر کی مقبولیت اور سندھی و پشتو میں مولانا کی کتابوں کے ترجموں کی تفصیل بھی خاصی معلومات افزا ہے، شروع میں فاضل مدیر کے قلم سے، اسلامی تحریکات اور اکیسویں صدی کے چیلنج فکر مودودی کی روشنی میں، کے عنوان سے نہایت مفصل اور مدلل تحریر اس خاص اشاعت کی جان ہے اور اس میں خاص طور پر سید مودودی کے طرز فکر کا جائزہ وسیع النظری اور بڑی حد تک غیر جانب داری سے لیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے فروغ میں پیش رووں کی فکر اور خدمات سے احترام اور وفاداری کے ساتھ استفادہ کرتے ہوئے نئے مسائل و معاملات سے نبرد آزما ہونے کی سعی کی جائے، یہ خاص شمارہ مولانا مودودی سے متعلق افہام و تفہیم میں بڑا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ماہ نامہ جام نور دہلی، رئیس القلم مولانا ارشد القادری نمبر: مدیر جناب خوشتر نورانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۹۶، قیمت ۱۰۰ روپے، زر سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: ماہ نامہ جام نور، ۴۲۲، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶۔

تقریر و تحریر، درس و تدریس اور گوناگوں قومی و ملی سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا ارشد القادری نے خاص شہرت حاصل کی، اپنے طبقہ میں وہ رئیس القلم، قاید ملت اور مناظر اعظم کے القاب سے معروف تھے لیکن دوسرے مسالک فکر میں بھی ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا اعتراف تھا، تعلیم و تبلیغ کے میدان میں ان کی مساعی خاص طور پر مستحسن قرار پائیں، ان کی ایک شناخت مسلکی مناظر کی بھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کے لیے اس سے کہیں زیادہ وسیع اور وقیع میدان

عمل کی ضرورت تھی، ان کو شاید اس کا احساس بھی تھا کہ "اہل سنت کے سارے علماء و مشائخ (الا ماشاء اللہ) صرف جلسہ، جلوس اور پیری مریدی کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں، کوئی بھی اس رخ پر نہیں سوچتا کہ ہمارے داخلی اور خارجی مسائل کیا ہیں، طاقت ور دشمنوں کے بیچ میں ہماری مسجدیں اور ہماری درس گاہیں کیوں کر محفوظ رہیں گی؟" جمشید پور کے فرقہ وارانہ فساد میں انہوں نے بڑی جرأت و ہمت سے ظالموں کا مقابلہ کیا، گرفتار بھی ہوئے اور ان کی گرفتاری کے خلاف ہر طبقے نے صدائے احتجاج بلند کی، اس خاص شمارے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا سیر حاصل جائزہ بڑے سلیقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔

مجلہ جمعیت ابنائے سلفیہ، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی نمبر: کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت درج نہیں، پتہ: جمعیت ابنائے سلفیہ، دربھنگہ، بہار۔

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی مرحوم، بہار ہی نہیں پورے ملک میں اپنی پرخلوص سرگرمیوں اور خوبیوں کی وجہ سے احترام اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے ان کی تعلیمی و فلاحی جد و جہد بڑی مبارک و مسعود تھی، بہار میں دار العلوم احمدیہ سلفیہ اور ملت کالج سے سلفیہ یونانی میڈیکل کالج تک ہر جگہ ان کی سعی و جہد کی اب بہار ہے، جماعت اہل حدیث کے رکن رکین اور مسلک سلفیہ کے شدید عامل ہونے کے باوجود وہ تحزب و تعصب سے پاک رہے، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے علاوہ دیوبند و ندوہ سے ان کے مخلصانہ مراسم تھے، دار المصنفین سے بھی ان کو خاص تعلق تھا، خوشی ہے کہ ایسی قابل قدر ہستی کی زندگی کے نقوش کو یکجا اور روشن کرنے کی سعی اس مجلہ کے ذریعہ کی گئی ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فعال و متحرک شخصیت کے لیے اس سے بہتر پیش کش کی ضرورت ہے اور اس کے لیے یہ مجلہ خاصا معاون ہو سکتا ہے۔

سہ روزہ دعوت، تحفظ شریعت اور آزاد ہندوستان نمبر، حصہ دوم: مدیر جناب پرواز رحمانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۲۶، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: دفتر دعوت، ڈی ۳۱۲، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔

روزنامہ اور سہ روزہ اخبار دعوت، اردو صحافت بلکہ ہندوستانی صحافت میں اس لحاظ سے منفرد اور نمایاں رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ تعمیری اور مقصدی جذبے کو ملحوظ رکھا، مادی نفع و نقصان کی میزان سے وہ

ہمیشہ گریزاں رہا، ایک خاص جماعت کے ترجمان ہونے کے باوجود اس نے قوم و ملت اور ملک کے اجتماعی مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ہر اہم ملی مسئلہ پر سنجیدہ مضامین اور تبصروں کے ذریعہ اپنے قارئین کو اصل مسائل اور ان کے حل سے روشناس کرایا، تقسیم ہند کے بعد جن مسائل نے مسلمانوں کو بے چین و مضطرب رکھا ان میں دستور ہند کے تحت مسلم پرسنل لا میں حکومت کی متوقع مداخلت کا اندیشہ اور وقتاً فوقتاً حکومت اور عدلیہ اور سیاسی جماعتوں کی جانب سے کسی نہ کسی شکل میں اعتراض و حملہ خاص طور پر نمایاں رہا، ملت اسلامیہ ہندیہ کے اہل حل و عقد نے اس خطرے کی اہمیت محسوس کی کہ اس راہ سے ان کی شریعت کے بنیادی اصولوں پر تیشہ زنی مقصود ہے، یکساں سول کوڈ کا مطالبہ اگرچہ ناقابل عمل ہے لیکن اس کی تکرار میں سماجی اصلاح سے زیادہ سیاسی مقاصد کارفرما ہیں، ۸۵ء میں شاہ بانو کیس نے یہی ثابت کیا، اس موقع پر مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت اور مسلمانان ہند کے اتحاد نے تحفظ شریعت کی اہمیت اور واضح کر دی، اخبار دعوت نے بھی اپنے مضامین اور تبصروں سے بڑی رہنمائی کی، زیر نظر خاص شمارے میں ایسی تمام تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، یہ محض وقتی نہیں، فقہ اسلامی کے ایک اہم مضمون کی حیثیت سے یہ مستقل مباحث ہیں، اس لیے یہ شمارہ واقعتہ دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔

ماہ نامہ ہمدرد نونہال، خاص نمبر: مدیر اعلا جناب مسعود احمد برکاتی، عمدہ کاغذ خوبصورت طباعت، صفحات ۲۲۴، قیمت: ۲۵ روپے، زر سالانہ: ۱۶۰ روپے، پتہ: دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی۔

جناب حکیم محمد سعید شہید کے علم و حکمت کی قبولیت کا راز اس کے نفع و تاثیر میں ہے، حکیم شہید کی نظر دوا کے علاوہ اصل مرض پر ہمیشہ رہی، ان کے ادارہ ہمدرد نے پاکستان میں علم و صحت کی ترویج میں جو بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں بچوں کا رسالہ نونہال بھی بہت اہم ہے، بچوں کے مزاج، ذہن اور نفسیات کے مطابق ان کی شخصیت و کردار سازی میں یہ رسالہ شاید بچوں کے ادب میں سب سے ممتاز ہے، زیر نظر خاص شمارہ بھی مفید مضامین، خوب صورت ترتیب اور رنگین اور دل کش تصاویر کی وجہ سے خود اپنی روایت کی عمدہ توسیع ہے۔

ع - ص

❁❁❁❁

مطبوعات جدیدہ

کتاب الملل والنحل: تالیف امام شہرستانی، مترجم پروفیسر علی محسن صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۷۷۳، قیمت: ۲۸۰ روپے، پتہ: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳، کراچی یونی ورسٹی، کراچی۔

علوم اسلامیہ کے تاریخی سرمایہ وورثہ میں کتاب الملل والنحل محتاج تعارف نہیں، اسلام کے معاصر اہم عالمی مذاہب اور خود مسلمانوں کے فرقوں کے حالات کا پانچویں صدی ہجری سے اب تک یہ مستند متداول ماخذ ہے، امام محمد ابوالفتح شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ نے عالم اسلام کے دور ابتلا میں اس اہم کتاب کی تالیف سے سیاسی زوال اور طوائف الملوکی کا داغ مٹانے کی کامیاب کوشش کی، وہ کثیر التصانیف صاحب قلم تھے لیکن شہرت عام اور بقائے دوام کی ضامن ان کی یہی کتاب الملل والنحل ثابت ہوئی، مختلف فصلوں اور ابواب میں منقسم، اہل اسلام، اہل کتاب، شبہ اہل کتاب، مجوس اور ہنود جیسے مذاہب اور ان کے تمام فرقوں کی تفصیل ایک حیرت انگیز علمی کارنامہ ہے، تاہم اردو زبان میں اس کا مکمل ترجمہ اب تک نہیں ہوسکا تھا، اس علمی ضرورت کو زیر نظر کتاب کے فاضل مترجم نے بہ حسن وخوبی پورا کیا، وہ کراچی یونی ورسٹی کے نیک نام معلم ہی نہیں، عربی زبان کے فاضل خصوصاً ترجمہ نگاری کے فن میں کامل بھی ہیں، اس سے پہلے بھی ان کے قلم سے کئی کامیاب ترجمے آچکے ہیں، تاریخ جہاں کشا کے ترجمہ کا ذکر ان صفحات میں چند ماہ قبل ہوا ہے، کتاب الملل جیسی کتاب کے اعلا علمی پایہ کو برقرار اور اس کے اسلوب کی عظمت کو قایم رکھنے کے ساتھ اس کو عام فہم بنانے میں مترجم کے لیے سخت آزمائش تھی لیکن وہ اس سے بہت کامیاب گزرے ہیں، شروع میں مبسوط مقدمہ کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق ہے، تحقیق وتوضیح کے لحاظ سے یہ بجائے خود بہت اہم ہے، تاہم بعض عبارتیں مبہم اور وضاحت طلب بھی آگئی ہیں مثلاً مامون کے دربار علمی کے بارے میں لکھا گیا کہ "یہاں علما کو نہایت آزادی سے اظہار رائے کا موقع دیا گیا، وہ مذاہب جو اپنی قومی حکومتوں کے دور میں بھی جرأت اظہار پر قادر نہ تھے، یہاں کھل کر اپنے عقاید بیان اور ثابت کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے" اس دور میں قومی حکومتوں اور جرأت اظہار پر قدرت نہ رکھنے والے علما کی بطور مثال نشان دہی مناسب ہوتی، بعض عبارتوں میں عربیت کے غلبے کی شمت نمایاں ہے جیسے "حکومتی استظہار کو توفق حاصل ہوگیا" توفق شاید تفوق ہے، "علم وفضل کی تلاشی و تنزل میں تلاشی" ناقابل فہم ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، کتاب کا نام کتاب الملل والنحل لکھا گیا ہے، شروع میں متنبی کے ایک مشہور شعر کی غلطی بھی ناگوار گزرتی ہے کہ والسیف والرمح والقرطاس والقلم۔ ع۔ص

☆☆☆